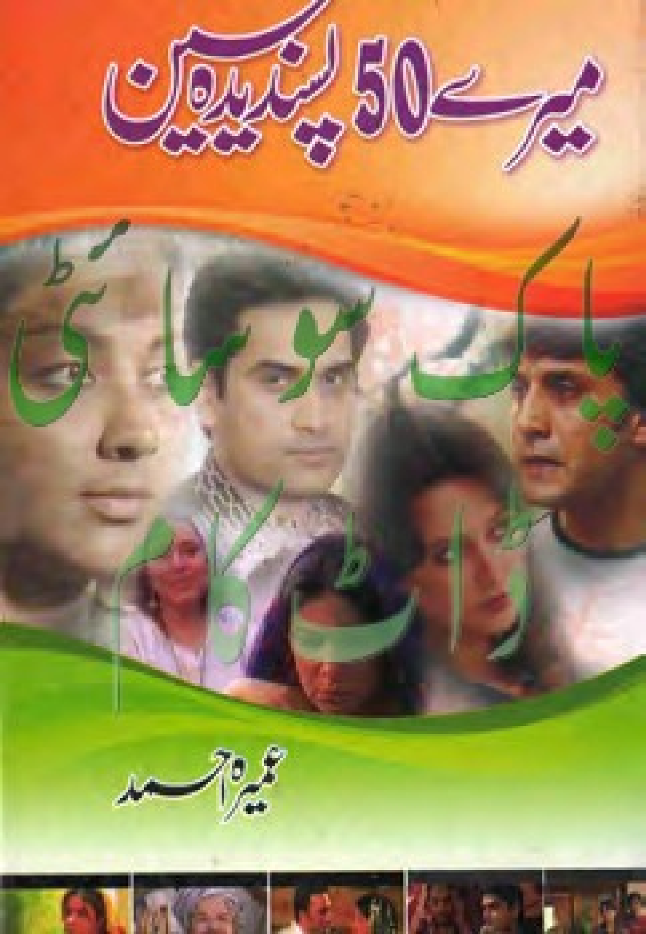
میرے 50 پسندیدہ سین
پاکستانی ڈراما
عمیرہ احمد

میرے 50 پسندیدہ سین

انتخاب

عمیرہ احمد

علم و عرفان پبلشرز

40-الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور، فون: 7232336 فیکس: 7352332

www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

پیش لفظ

مجھ سے لوگ اکثر یہ پوچھتے ہیں کہ آپ کی پسندیدہ تحریر کون سی ہے یا پھر یہ کہ آپ اپنی کس تحریر کو بار بار پڑھتی ہیں۔ پسندیدہ تحریر کے جواب میں تو میں اپنی چند تحریروں کا نام دے سکتی ہوں مگر کس تحریر کو میں بار بار پڑھتی ہوں ...... کسی تحریر کو دوبارہ پڑھنا مشکل کام ہے۔ میں تو کسی دوسرے کی کتاب کو بھی دوسری دفعہ نہیں پڑھتی اور کہاں یہ کہ اپنی ہی کسی تحریر کو بار بار پڑھا جائے۔

لیکن یہ ضرور ہے کہ اب تک لکھی جانے والی اپنی تمام تحریروں میں کچھ سین ایسے ہیں جو مجھے بے حد پسند ہیں اور میں پوری کتاب پڑھنے کی بجائے صرف وہ سین نکال کر پڑھتی ہوں۔ کتاب کو اس طرح پڑھنے کا اپنا ایک مزہ ہوتا ہے اور اپنی بعض تحریریں مجھے صرف کسی خاص سین کی وجہ سے پسند ہوتی ہیں کیونکہ پوری تحریر نہیں کبھی کبھار صرف ایک سین اتنا اچھا لکھا جاتا ہے۔ کہ وہ تحریر اُسی سین کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔

ٹیلی ویژن کے لئے لکھنا شروع کرنے کے بعد مجھے خاص طور پر اس بات کا احساس ہوا کہ صرف کردار نگاری نہیں منظر نگاری بھی بہت اہم ہوتی ہے۔

پاپولر فکشن میں کبھی بھی کسی رائٹر نے اپنے منتخب کردہ سینز کو کسی مجموعے کی صورت میں پیش نہیں کیا۔ میں کر رہی ہوں۔ یہ اُردو فکشن میں ایک نئی چیز ہے۔ اور میں اُمید کرتی ہوں آپ اسے پسند کریں گے۔

آپ جن سینز کو اس کتاب میں پڑھیں گے وہ میری تحریروں کے بہترین سینز ہیں اور یہ وہ حصے ہیں جنہیں میں بار بار پڑھتی ہوں اور جن میں مجھے وہ خامیاں نظر نہیں آتی جو مجھے اپنی ہر تحریر میں نظر آتی ہیں۔

عمیرہ احمد

15 اگست 2001ء

سین 1

میں آج تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ میرے باپ نے اتنے بڑے حادثے کے بعد اپنا ذہنی توازن کیوں نہیں کھویا...... مظفر سے زیادہ اسے کسی سے محبت نہیں تھی۔ میں نے خود نہیں دیکھا مگر دیکھنے والے کہتے ہیں میرے باپ نے میرے بھائی کی لاش کے تمام ٹکڑے خود اکٹھے کیے تھے' برستی آنکھوں کے ساتھ...... کسی چیخ و پکار کے بغیر۔ اس نے میرے بھائی کا پورا جسم اکٹھا کیا' وہ ہر چکر کے بعد جسم کے ٹکڑے دوبارہ گنتا پھر جو ٹکڑے کم ہوتے ان کے نام دہراتا۔ دائیں ٹانگ...... ناک...... بایاں کان...... بایاں ہاتھ...... پیر کا انگوٹھا...... دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں......

ہاتھ کی دو انگلیاں وہ آدھ گھنٹہ ڈھونڈتا رہا۔ جب وہ مل گئیں تو اسے جیسے قرار آ گیا۔ اب اس کے بیٹے کا جسم نامکمل نہیں رہا تھا۔ وہ جسم کا ہر ٹکڑا اٹھا کر اس پر لگی ہوئی گرد اور مٹی صاف کر دیتا اگرچہ وہ خون خشک نہیں کر پاتا تھا مگر وہ سارے تنکے اور مٹی کو ضرور صاف کر دیتا۔ اس کے کندھے پر لٹکا ہوا کپڑا اس خون آلود مٹی اور تنکوں سے بھر گیا تھا۔ میرے بھائی کی عمر اس وقت صرف بیس سال تھی' پورا گاؤں جانتا تھا کہ وہ شریف اور ہر ایک کی عزت کرنے والا تھا۔ اسے کبھی کسی نے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ مسلم لیگ کے لیے کام کرنے کے علاوہ اس نے زندگی میں کوئی جرم نہیں کیا تھا اور یہ کوئی معمولی جرم نہیں تھا۔ کم از کم اس زمانے میں اتنی بے رحمی کے ساتھ قتل ہونے کے لیے صرف دو چیزیں کافی تھیں۔ مسلمان ہونا اور پھر مسلم لیگ کا حامی ہونا۔ اور بدقسمتی سے میرے بھائی میں دونوں خصوصیات تھیں۔

میرے بھائی کے جسم کے ٹکڑے اکٹھے کرنے کے بعد میرے باپ نے درخت سے میری ماں کا جسم اتارا تھا۔ پھر وہ دونوں لاشیں گھر لے آیا۔ میں اور میری دونوں بہنیں سکتے میں آ گئے تھے۔ اگرچہ میرے باپ نے ہم تینوں کو وہ لاشیں دیکھنے نہیں دیں۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ہم تینوں کو خوف اور صدمے کے مارے کچھ...... میں اس وقت چودہ سال کا تھا' میری چھوٹی بہن ساڑھے پندرہ سال کی تھی اور منجھلی بہن سترہ سال کی۔

بھائی کی لاش کو میرے باپ نے خود غسل دیا۔ غسل دینے کے بعد اس نے ایک سفید

چادر پر اس کے جسم کے ٹکڑے رکھے اور اس کے اوپر دوسری سفید چادر ڈال کر دونوں چادروں کو چاروں جانب سے سی دیا۔ میں نے اپنے باپ کو کبھی سوئی ہاتھ میں نہیں لیتے دیکھا' ٹانکہ کیسے لگاتے ہیں' یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ بہرحال اس دن ان چادروں کو اس نے خود ہی سیا تھا۔ کیسے سیا ہوگا۔ میں نہیں جانتا کیونکہ اس نے یہ کام اکیلے کمرے میں بند ہو کر کیا تھا۔ جب کمرے کا دروازہ کھلا تو ہم نے صرف وہ سفید بوری سی دیکھی جو اب بھی جگہ جگہ سے خون سے تر ہو رہی تھی۔

اپنی اڑسٹھ سالہ زندگی میں' میں نے آج تک کسی کو ویسا کفن پہنے نہیں دیکھا۔ میری دونوں بہنیں زار و قطار رو رہی تھیں مگر میں ...... میں خوف زدہ تھا ...... یہ سب کیوں ہوا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ کس نے کیا تھا؟ ان سے بڑا سوال میرے لیے یہ تھا کہ شکیلہ باجی کہاں ہیں؟

میرے اس سوال کا جواب چوتھے دن مل گیا' جب میرا باپ جنگل سے ان کی لاش لایا تھا۔ ہم نے ان کا چہرہ بھی نہیں دیکھا شاید ......شاید وہ بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

''تمہیں منع کیا تھا کہ اپنے بیٹے کو ایسے کام مت کرنے دو۔ تم نے بات نہیں سنی' اب ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ تم تو جانتے ہو جوان خون گرم ہوتا ہے۔ لڑکوں کو بڑا غصہ تھا تمہارے بیٹے پر ...... جوش میں کر بیٹھے یہ سب کچھ ...... اب صحیح پتا بھی نہیں ہے کہ کس کس نے حصہ لیا اس کام میں ...... اس لیے پولیس کو کیا بتاتے۔ تم بس بھول جاؤ یہ سب کچھ ...... ہمیں بڑا دکھ ہے جو کچھ تمہارے گھر والوں کے ساتھ ہوا ہے مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ غلطی تمہارے بیٹے ہی کی ہے ...... جس نے ایک غلط کام کی ابتدا کی۔''

گاؤں کے سرپنچ سردار جوگندر سنگھ نے میرے باپ کی دادرسی ان الفاظ میں کی تھی۔

''غلط کام ......'' شاید میرے باپ نے پہلی بار وہاں بیٹھ کر غلط کام کی تعریف کے بارے میں سوچا ہوگا اور شاید ...... اس دن ہی پہلی بار گھر آتے ہوئے اس نے راستے میں کھڑے ہندو اور سکھ لڑکوں کو دیکھا ہوگا۔ ان کے قہقہوں پر غور کیا ہوگا اور پھر شاید یہ اندازہ لگانے کی کوشش بھی کی ہوگی کہ ان میں سے کس نے اس کی بیوی کی گردن کاٹی۔ کتنوں نے اس کے بیٹے کے ٹکڑے کیے اور کس کس نے اس کی بیٹی ...... بہرحال وہ گھر آ گیا تھا' خاموشی اور بے بسی کے ساتھ ...... جھکے ہوئے کندھوں اور خالی آنکھوں کے ساتھ ...... خاموش زبان اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ ...... پھر اس دن کے بعد وہ دوبارہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلا نہ ہی ہم تینوں میں سے کوئی کہیں گیا۔

شہرِ ذات

سین 2

اس سہ پہر وہ دونوں راوی کی سیر کے لئے گئے تھے۔ شادی سے پہلے بھی وہ دونوں اکثر یہاں آیا کرتے تھے۔ فلک کو یہاں دریا کے کنارے پر تنہائی اور خاموشی میں آ کر بیٹھنا بہت پسند تھا۔ بعض دفعہ جب سلمان اس کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ اپنی کسی دوست کو ساتھ لے آتی۔ کشتی کے ذریعے وہ کامران کی بارہ دری میں چلے گئے۔ دریا کے وسط میں بنی ہوئی یہ مغلیہ دور کی عمارت اسے بڑی اٹریکٹ کیا کرتی تھی۔ سلمان اور وہ بارہ دری کے مختلف حصوں میں پھرتے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر جب شام ڈھلنے لگی تو وہ دونوں ایک بار پھر کشتی کے ذریعے بارہ دری سے واپس کنارے پر آ گئے تھے۔

کنارے سے اوپر سڑک پر جانے کے لئے انہوں نے چلنا شروع کیا تھا جب فلک نے پھٹے کپڑوں اور لمبے بالوں اور داڑھی والے ایک فقیر کو دیکھا تھا۔ وہ دریا کے کنارے پر کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی داڑھی اور بالوں میں کیچڑ لگا ہوا تھا اور پھٹے کپڑوں میں سے اس کا سیاہ سوکھا ہوا جسم نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی قمیض کے دامن میں کچھ پتھر اکٹھے کئے ہوئے تھے اور وہ وقفے وقفے اس گڑھے میں پتھر پھینک رہا تھا۔ پتھر گرنے پر کیچڑ اور پانی اچھل کر ادھر اُدھر گر رہا تھا۔ ان دونوں کو فقیر کے سامنے سے گزر کر جانا تھا اور فلک کا خیال تھا کہ ان کے گزرتے وقت فقیر پانی والے گڑھے میں پتھر نہیں پھینکے گا یہی اطمینان لئے وہ باتیں کرتی ہوئی سلمان کے ساتھ اس گڑھے کے پاس سے گزرنے لگی اور اسی وقت فقیر نے اپنی گود میں رکھا ہوا سب سے بڑا پتھر اٹھا کر گڑھے میں پھینکا تھا۔ ایک چھپاکے کے ساتھ گدلا پانی اڑ کر فلک کے چہرے اور لباس کو داغدار کر گیا تھا۔ سلمان دوسری جانب تھا اس کے کپڑوں پر بھی چھینٹے پڑے مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی مگر فلک کے سفید لباس پر وہ کیچڑ بہت نمایاں ہو گیا تھا۔

''یو ایڈیٹ! اندھے ہو تم' نظر نہیں آتا تمہیں کہ کوئی گزر رہا ہے۔'' وہ غصے کے عالم میں چلائی تھی۔

''میں واقعی اندھا ہوں۔ مجھے دنیا نظر نہیں آتی۔''

وہ اس کی بات پر ایک لمحے کے لئے ساکت ہوگئی تھی۔ اپنے حلیے کے برعکس اس فقیر کی آنکھوں اور آواز میں بہت سکون' بہت ٹھہراؤ تھا۔ اس کا لب ولہجہ بہت شائستہ تھا۔ وہ ان پڑھ نہیں لگتا تھا۔

''اگر اندھے ہو تو یہاں بیٹھ کر لوگوں کو گندا کیوں کر رہے ہو جاؤ کہیں اور جا کر بیٹھو یا اپنے ہاتھوں پر قابو رکھو۔'' اس کا غصہ پھر عود کر آیا۔ اس نے ٹشو نکال کر چہرے سے کیچڑ صاف کرنا شروع کیا تھا۔

''بی بی! تو گندگی سے کیوں ڈرتی ہے۔ تجھے کیا لگتا ہے' یہ کیچڑ تجھے کسی کی نظر سے اوجھل کر دے گا۔ تجھے لگتا ہے اتنا سا کیچڑ اس شخص کی محبت کو ختم کر دے گا۔''

اس بار اس نے عجیب سے لہجے میں سلمان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔

''اس شخص کی پروا نہ کر۔ اللہ کی پروا کر۔ اللہ کو کیچڑ اور گندگی سے غرض نہیں ہوتی۔ اس کی نظر میں جو ایک بار آ جاتا ہے۔ ہمیشہ رہتا ہے اور اس نظر کو کیچڑ کی پروا نہیں ہوتی۔ یہ دیکھو دیکھو۔''

وہ یک دم اٹھ کر کیچڑ کے اس گڑھے کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور پھر اس نے کیچڑ نکال نکال کر اپنے چہرے اور لباس پر ملنا شروع کر دیا۔

''دیکھو' میں تو کیچڑ سے نہیں ڈرتا۔ میں تو گندگی سے خوف نہیں کھاتا۔ جانتا ہوں۔ اس کی نظر اس کیچڑ اور گندگی پر نہیں جائے گی۔ وہ صرف میرے وجود کو دیکھے گا۔''

اس بار بات کرتے ہوئے وہ ہذیانی کیفیت میں تھا۔ وہ ٹشو کے ساتھ چہرہ صاف کرتے ہوئے اسے دیکھتی رہی اور اس کے اشتعال میں اضافہ ہوتا گیا تھا۔ ''میں جس کی نظر میں ہوں' میرے لئے کافی ہے۔ مجھے جس کی محبت چاہئے' مل چکی ہے مجھے اور کسی کی محبت کی پروا نہیں ہے۔''

''یہ تو دروازہ ہے' دروازے کا کام رستہ دینا ہوتا ہے یا رستہ روکنا' تیرا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ تیرا ہی کیا ہر عورت کا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ آگے جانے ہی نہیں دیتا۔ اسے لے کر کیا کرے گی تو یہ کل نہیں ہے بی بی! یہ کل نہیں ہے۔ تو کل کی خواہش کیوں نہیں کرتی وجود کی طلب کیوں ہے تجھے۔ ذات کی چاہ کیوں نہیں ہے؟۔'' اس کا ہاتھ ایک بار پھر سلمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

''تم بھکاری لوگ رستے میں بیٹھ جاتے ہو اور پھر بکواس کرنا شروع کر دیتے ہو چلو سلمان۔''

اس نے یک دم سلمان کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چلنا شروع کر دیا جواب تک بالکل خاموشی سے ساری گفتگو سنتا رہا تھا۔

''ہر ایک کو بھکاری بنا کر رستے میں بٹھایا ہوا ہے اور ہر ایک خود کو مالک سمجھتا ہے جب تک ٹھوکر نہیں لگتی' جب تک گھٹنوں پر نہیں گرتا۔ اپنی اوقات کا پتا ہی نہیں چلتا۔ وجود کے نصیب میں ہے بھکاری ہونا' بس ذات بھکاری نہیں ہو سکتی۔ وجود کے مقدر میں مانگنا ہے' ذات کا وصف دینا ہے۔ میں کیا' تو کیا بی بی! سب بھکاری ہیں۔ آج نہیں تو کل' کل نہیں تو پرسوں' کبھی نہ کبھی بھکاری بننا ہی پڑتا ہے۔ مانگنا ہی ہوتا ہے۔ کوئی عشق مانگتا ہے کوئی دنیا اور جو یہ نہیں مانگتا وہ خواہش کا ختم ہو جانا مانگتا ہے۔''

وہ فقیر بلند آواز میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ اوپر سڑک کی طرف جاتے ہوئے بھی اس کی بڑبڑاہٹ اس کے کانوں میں آ رہی تھی اور اس کے اشتعال میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''تم بھی عجیب ہو سلمان! تم سے اتنا نہیں ہوا کہ اسے جھڑک ہی دو' وہ کس طرح مجھ سے بات کر رہا تھا۔ مگر تم بالکل چپ کھڑے رہے۔'' اس نے یک دم سلمان سے کہنا شروع کیا تھا۔

''میں کیا کہتا اسے' وہ کوئی پاگل تھا۔ اس سے بحث کر کے مجھے کیا ملتا۔ تم نے بھی تو بحث کی ہے۔ کیا فائدہ ہوا۔ بہتر تھا' تم بات بڑھاتی ہی نہ خاموشی سے نظر انداز کر کے وہاں سے آ جاتی۔''

سلمان نے اس سے کہا تھا۔ وہ اس کی بات پر کچھ اور بھڑک اٹھی۔ ''اسے نظر انداز کر کے آ جاتی تاکہ وہ کسی اور کے ساتھ بھی یہی کچھ کرتا' پاگل نہیں تھا وہ' ڈھونگی تھا دیکھا نہیں کس طرح کی باتیں کر رہا تھا۔ کیا باتوں سے اس کے پاگل پن کا پتہ چلتا ہے' نئے نئے طریقے اپنائے ہوئے ہیں ان لوگوں نے بھیک مانگنے کے۔ ہر جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور تمہارے جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی ان کا حوصلہ اتنا بڑھ جاتا ہے۔ میرا تو دل چاہ رہا تھا' میں وہی پتھر اٹھا کر اس کے سر پر ماروں۔ اسے پتا تو چلے۔ اندھا ہے وہ الو کا پٹھا۔'' اس کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''کول ڈاؤن یار! اب اتنا زیادہ غصہ کرنے کا کیا فائدہ ہے' جو ہو گیا سو گیا۔ اب ان باتوں کو دوہرانے کا کیا فائدہ' گھر چل رہے ہیں' تم کپڑے بدل لینا بلکہ نہا لینا۔ یہ کیچڑ ختم ہو جائے گی۔ تم خوامخواہ اس بات کو سر پر سوار کر رہی ہو۔''

سلمان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ''خیر میں کسی بھی بات کو خوامخواہ سر پر سوار نہیں کیا کرتی۔ جو بات ٹھیک تھی' میں نے وہی کہی ہے۔ آئندہ کم از کم کسی دوسرے کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے دس بار تو سوچے گا۔'' اس کا غصہ ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا مگر اس نے مزید کوئی بات نہیں کی تھی سلمان نے بھی اس کے خاموش ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا تھا گھر پہنچنے تک اس کے ذہن سے یہ بات نکل چکی تھی۔

پیرِ کامل

سین 3

وہ احرام باندھے خانہ کعبہ کے صحن میں کھڑا تھا۔ خانہ کعبہ میں کوئی نہیں تھا۔ دور دور تک کسی وجود کا نشان نہیں تھا۔ رات کے پچھلے پہر آسمان پر چاند اور ستاروں کی روشنی نے صحن کے ماربل سے منعکس ہو کر وہاں کی ہر چیز کو ایک عجیب سی دودھیا روشنی میں نہلا دیا تھا۔ چاند اور ستاروں کے علاوہ وہاں اور کوئی روشنی نہیں تھی۔

خانہ کعبہ کے غلاف پر لکھی ہوئی آیات' سیاہ غلاف پر عجیب طرح سے روشن تھیں۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا اور اس گہرے سکوت کو صرف ایک آواز توڑ رہی تھی۔ اس کی آواز...... اس کی اپنی آواز...... وہ مقام ملتزم کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی نظریں خانہ کعبہ کے دروازے پر تھیں اور وہ سر اٹھائے بلند آواز سے کہنے لگا۔

''لبیک اللھم لبیک o لبیک لاشریک لک لبیک o ان الحمد والنعمة لک و الملک لاشریک لک o''

(حاضر ہوں میرے اللہ میں حاضر ہوں' حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں' میں حاضر ہوں' بیشک حمد وثنا تیرے لئے ہے' نعمت تیری ہے' بادشاہی تیری ہے کوئی تیرا شریک نہیں)۔

پوری قوت سے گونجتی ہوئی اس کی آواز خانہ کعبہ کے سکوت کو توڑ رہی تھی۔ اس کی آواز خلا کی وسعتوں تک جا رہی تھی۔

''لبیک اللھم لبیک......''

ننگے پاؤں' نیم برہنہ وہاں کھڑا وہ اپنی آواز پہچان رہا تھا۔

''لبیک لاشریک لک لبیک وہ صرف اس کی آواز تھی۔ **ان الحمد والنعمة لک و الملک''**

اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو اس کی ٹھوڑی سے نیچے اس کے پیروں کی انگلیوں پر گر رہے تھے۔

''لاشریک لک''

اس کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے۔

''لبیک اللھم لبیک''

اس نے خانہ کعبہ کے غلاف پر کندہ آیات کو یک دم بہت روشن دیکھا۔ اتنا روشن کہ وہ جگمگانے لگی تھیں۔ آسمان پر ستاروں کی روشنی بھی اچانک بڑھ گئی تھی۔ وہ ان آیات کو دیکھ رہا تھا۔ مبہوت سحر زدہ۔ کسی معمول کی طرح' زبان پر ایک ہی جملہ لئے ...... اس نے خانہ کعبہ کے دروازے کو بہت آہستہ آہستہ کھلتے دیکھا۔

''لبیک اللھم لبیک''

اس کی آواز اور بلند ہوگئی۔ ایک ورد کی طرح۔ ایک سانس۔ ایک لے۔

''لبیک لاشریک لک لبیک''

اس وقت پہلی بار اس نے اپنی آواز میں کسی اور آواز کو مدغم ہوتے محسوس کیا۔

''ان الحمد والنعمته ......''

اس کی آواز کی طرح وہ آواز بلند نہیں تھی۔ کسی سرگوشی کی طرح تھی۔ کسی گونج کی طرح' مگر وہ پہچان سکتا تھا وہ اس کی آواز کی گونج نہیں تھی۔ وہ کوئی اور آواز تھی۔

''لک والملک......''

اس نے پہلی بار خانہ کعبہ میں اپنے علاوہ کسی اور کی موجودگی کو محسوس کیا۔

''لاشریک لک......''

خانہ کعبہ کا دروازہ کھل رہا تھا۔

''لبیک اللھم لبیک......''

وہ اس نسوانی آواز کو پہچانتا تھا

''لبیک لاشریک لک''

وہ اس کے ساتھ وہی الفاظ دہرا رہی تھی۔

''لبیک ان الحمد و النعمة''

آواز دائیں طرف نہیں تھی' بائیں طرف تھی۔ کہاں ...... اس کی پشت پر۔ چند قدم کے فاصلے پر۔

''لک والملک لا شریک لک''

اس نے جھک کر اپنے پاؤں پر گرنے والے آنسوؤں کو دیکھا اس کے پاؤں بھیگ چکے تھے۔

اس نے سر اٹھا کر خانہ کعبہ کے دروازے کو دیکھا۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ اندر روشنی تھی۔ دودھیا روشنی۔ اتنی روشنی کہ اس نے بے اختیار گھٹنے ٹیک دیئے۔ وہ اب سجدہ کر رہا تھا' روشنی کم ہو

رہی تھی۔ اس نے سجدے سے سر اٹھایا۔ روشنی اور کم ہو رہی تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خانہ کعبہ کا دروازہ اب بند ہو رہا تھا۔ روشنی اور کم ہوتی جا رہی تھی اور تب اس نے ایک بار پھر سرگوشی کی صورت میں وہی نسوانی آواز سنی۔

اس بار اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔

سالار کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حرم شریف کے ایک برآمدے کے ستون سے سر ٹکائے ہوئے تھا۔ وہ کچھ دیر ستانے کے لئے وہاں بیٹھا تھا مگر نیند نے عجیب انداز میں اس پر غلبہ پایا۔

وہ امامہ تھی۔ بے شک امامہ تھی۔ سفید احرام میں اس کے پیچھے کھڑی۔ اس نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی مگر ایک جھلک بھی اسے یقین دلانے کے لئے کافی تھی کہ وہ امامہ کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ خالی الذہنی کے عالم میں لوگوں کو ادھر سے اُدھر جاتے دیکھ کر بے اختیار اس کا دل بھر آیا۔

آٹھ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا اسے اس عورت کو دیکھے جسے اس نے آج وہاں حرم شریف میں خواب میں دیکھا تھا کسی زخم کو پھر ادھیڑا گیا تھا۔ اس نے گلاسز اُتار دیئے اور دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔

آنکھوں سے ابلتے گرم پانی کو رگڑتے، آنکھوں کو مسلتے اسے خیال آیا۔ یہ حرم شریف تھا۔ یہاں اسے کسی سے آنسو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں سب آنسو بہانے کے لئے ہی آتے تھے۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لئے۔ اس پر رقت طاری ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکائے بہت دیر وہاں بیٹھا روتا رہا۔

پھر اسے یاد آیا وہ ہر سال وہاں عمرہ کرنے کے لئے آیا کرتا تھا۔ وہ امامہ ہاشم کی طرف سے بھی عمرہ کیا کرتا تھا۔

وہ اس کی عافیت اور لمبی زندگی کے لئے بھی دعا مانگا کرتا تھا۔

وہ امامہ ہاشم کو ہر پریشانی سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی دعا مانگا کرتا تھا۔

اس نے وہاں حرم شریف میں اتنے سالوں میں اپنے اور امامہ کے لئے ہر دعا مانگ چھوڑی تھی جہاں بھر کی دعائیں، مگر اس نے وہاں حرم شریف میں کبھی امامہ کو اپنے لئے نہیں مانگا تھا۔ عجیب بات تھی مگر اس نے وہاں کبھی امامہ کے حصول کے لئے دعا نہیں کی تھی۔ اس کے آنسو یک دم تھم گئے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وضو کے بعد اس نے عمرے کے لئے احرام باندھا۔ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے اس بار اتفاقاً اسے مقام ملتزم کے پاس جگہ مل گئی۔ وہاں جہاں اس نے اپنے آپ کو خواب میں کھڑے دیکھا تھا۔

اپنے ہاتھ اوپر اُٹھاتے ہوئے اس نے دعا کرنا شروع کی۔

''یہاں کھڑے ہو کر تجھ سے انبیاء دعا مانگا کرتے تھے۔ ان کی دعاؤں میں اور میری دعا میں بہت فرق ہے۔''

وہ گڑگڑا رہا تھا۔

''میں نبی ہوتا تو نبیوں جیسی دعا کرتا مگر میں تو عام بشر ہوں اور گناہگار بشر۔ میری خواہشات، میری آرزوئیں سب عام ہیں۔ یہاں کھڑے ہو کر کبھی کوئی کسی عورت کے لئے نہیں رویا ہو گا، میری ذلت اور پستی کی اس سے زیادہ انتہا کیا ہو گی کہ میں یہاں کھڑا...... حرم پاک میں کھڑا ...... ایک عورت کے لئے گڑگڑا رہا ہوں مگر مجھے نہ اپنے دل پر اختیار ہے نہ اپنے آنسوؤں پر۔

یہ میں نہیں تھا جس نے اس عورت کو اپنے دل میں جگہ دی، یہ تو نے کیا۔ کیوں میرے دل میں اس عورت کے لئے اتنی محبت ڈال دی کہ میں تیرے سامنے کھڑا بھی اس کو یاد کر رہا ہوں؟ کیوں مجھے اس قدر بے بس کر دیا کہ مجھے اپنے وجود پر بھی کوئی اختیار نہیں رہ؟ میں وہ بشر ہوں جسے تو نے ان تمام کمزوریوں کے ساتھ بنایا۔ میں وہ بشر ہوں جسے تیرے سوا کوئی راستہ دکھانے والا نہیں اور وہ عورت وہ میری زندگی کے ہر راستے پر کھڑی ہے۔ مجھے کہیں جانے کہیں پہنچنے نہیں دے رہی یا تو اس کی محبت کو اس طرح میرے دل سے نکال دے کہ مجھے کبھی اس کا خیال تک نہ آئے یا پھر اسے مجھے دے دے۔ وہ نہیں ملے گی تو میں ساری زندگی اس کے لئے ہی روتا رہوں گا۔ وہ مل جائے گی تو تیرے علاوہ میں کسی کے لئے آنسو نہیں بہا سکوں گا۔ میرے آنسوؤں کو خالص ہونے دے۔

میں یہاں کھڑا تجھ سے پاک عورتوں میں سے ایک کو مانگتا ہوں۔

میں امامہ ہاشم کو مانگتا ہوں۔

میں اپنی نسل کے لئے اس عورت کو مانگتا ہوں، جس نے آپ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں کسی کو شریک نہیں کیا۔ جس نے ان کے لئے اپنی زندگی کی تمام آسائشات کو چھوڑ دیا۔

اگر میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی نیکی کی ہے، تو مجھے اس کے عوض امامہ ہاشم دے دے۔ تو چاہے تو یہ اب بھی ہو سکتا ہے۔ اب بھی ممکن ہے۔

مجھے اس آزمائش سے نکال دے۔ میری زندگی کو آسان کر دے۔

آٹھ سال سے میں جس تکلیف میں ہوں مجھے اس سے رہائی دے دے۔

سالار سکندر پر ایک بار پھر رحم کر، وہی جو تیری صفات میں افضل ترین ہے۔

وہ سر جھکائے وہاں بلک رہا تھا اسی جگہ پر جہاں اس نے خود کو خواب میں دیکھا تھا مگر اس بار اس کی پشت پر امامہ ہاشم نہیں تھی۔

بہت دیر تک وہاں گڑگڑانے کے بعد وہ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ آسمان پر ستاروں کی

روشنی اب بھی مدھم تھی۔ خانہ کعبہ روشنیوں سے اب بھی بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ لوگوں کا ہجوم رات کے اس پہر بھی اسی طرح تھا۔ خواب کی طرح خانہ کعبہ کا دروازہ بھی نہیں کھلا تھا۔ اس کے باوجود وہاں سے ہٹتے ہوئے سالار سکندر کو اپنے اندر سکون اُترتا محسوس ہوا تھا۔

وہ اس کیفیت سے باہر آ رہا تھا جس میں وہ پچھلے ایک ماہ سے تھا۔ ایک عجیب سا قرار تھا جو اس دعا کے بعد اسے ملا تھا اور وہ اسی قرار اور طمانیت کو لئے ہوئے ایک ہفتہ کے بعد پاکستان لوٹ آیا تھا۔

کوئی لمحہ خواب نہیں ہوتا

سین 4

وہ اب وہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ گھر کے سامنے والے لان میں صرف چند آدمی تھے۔ باقی سب عقبی لان میں تھے۔ اسٹیریوز پوری آواز سے انگلش نمبر بجا رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل آئی۔

''کاش دنیا میں میرے علاوہ کوئی اور نہ ہوتا۔ کم از کم اس وقت تو۔''

اس نے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے سوچا تھا۔ باہر کی سڑک ویران تھی اور وہاں گاڑیاں کھڑی تھیں اور اس خاموشی میں وہ فل والیم پر بجنے والے انگلش نمبر کو با آسانی سن سکتی تھی۔

اس نے چلتے ہوئے اپنے چہرے پر چند قطرے گرتے محسوس کئے۔ اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اسٹریٹ لائٹس سڑک پر گرنے والے قطروں کو بہت واضح کر کے دکھا رہی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر سر جھکا لیا۔

''میں پچھلے ڈیڑھ سال سے یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھ کب کوئی ایسی حرکت کی تھی کہ آپ میرے بارے میں اتنی خراب رائے رکھنے پر مجبور ہو گئیں۔''

اس نے اپنے پیچھے چاپ سنی اور پھر کسی کو کہتے سنا۔ الوژن ایک بار پھر اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

اس نے اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اب اس کے برابر چل رہا تھا۔ وہ بھی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ سڑک پر اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ یوں بول رہا تھا جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔

''میرا خیال ہے' میں نے اس ایک سال میں جو آپ نے یہاں گزارا تھا۔ ہمیشہ آپ کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔ تحفظ دینے کی کوشش کی تھی پھر بھی آپ کیلئے میں ایک فلرٹ' آوارہ اور لفنگا انسان ہوں۔'' بارش کے قطرے تیز ہونے لگے تھے۔

''یہ ٹھیک ہے کہ لڑکیوں کے ساتھ میری دوستی ہوتی تھی۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ میری کچھ باتوں کی وجہ سے آپ غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھیں جیسے آپ نے یہ سوچ لیا کہ میں اپنی ماں کے ظلم و ستم

سے عاجز ہوں اور میرے پاس روپے نہیں ہیں مگر یہ آپ کی غلطی تھی۔ میری نہیں۔ آپ نے سب کے سامنے مذاق میں کہی جانے والی باتوں کو اتنی سنجیدگی سے کیوں لیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آپ مجھ پر ترس کھانے لگی ہیں یا میری باتوں پر اعتبار کرنے لگی ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب آپ نے مجھے روپے دیئے اور پھر بعد میں ہر ماہ مجھے میری ضرورت کی چیزیں بھجوانے لگیں۔ میں ہر ماہ وہ پیکٹ دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ مجھے کون اس طرح شرٹس اور دوسری چیزیں بھجوا رہا ہے پھر مجھے آپ پر شک ہوا تھا اور میرا یہ شک ٹھیک تھا۔''

اس کے گالوں پر اب گرم قطرے بھی گرنے لگے تھے۔ اسٹیریو پر گونجتی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

Smile an everlasting smile A smile can bring you near to me.

Don`t ever let me find you gone`cos that would bring a tear to me.

اسے یاد آیا۔ وہ پہلے اسے ہمیشہ تم کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور آج وہ اسے آپ کہہ رہا تھا۔

''میں آپ کو منع کرنا چاہتا تھا۔ بتانا چاہتا تھا۔ آپ کی غلط فہمی کے بارے میں مگر میں اتنی ہمت نہیں کر سکا۔ میں آپ کو شرمندہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر میرا خیال تھا' آپ سب کچھ جان گئی ہیں۔ جب اسٹڈی میں آیا کرتی تھیں تو میرا خیال تھا کہ آپ میرے بارے میں اچھے جذبات رکھتی ہیں۔ آپ اس لئے وہاں آتی ہیں۔ آج یہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی۔ آپ تو واصف کی اسٹڈی سمجھ کر وہاں آیا کرتی تھیں۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کو میری کون سی بات بری لگی تھی جس سے آپ نے میرا ایسا خاکہ بنا لیا کہ میں پچھلے ڈیڑھ سال سے فری کی باتوں کو بھول نہیں پایا۔''

''میں نے فری سے کچھ نہیں کہا تھا' کچھ بھی نہیں۔'' وہ ایک لمحے کو ٹھٹھک کر رکا۔ ''پھر فری نے کیوں؟'' وہ بڑبڑایا۔

''مرد کو محبت نہیں کرنی چاہئے' وہ محبت افورڈ ہی نہیں کر سکتا۔ یہ بندے کو رسوا کر کے رکھ دیتی ہے۔ کم از کم مجھے تو نہیں کرنی چاہئے تھی اچھا بھلا زندگی گزار رہا تھا اور پھر بس۔''

وہ اسے اس طرح بتا رہا تھا جیسے کسی تیسرے کے بارے میں بتا رہا ہو۔

''ہاں محبت نہیں کرنی چاہئے۔'' اس نے دل میں اعتراف کیا تھا۔

''پچھلے ڈیڑھ سال میں خود کو یہی سمجھا رہا ہوں کہ محبت بے کار چیز ہے۔ کیا ہے اگر نہیں ملتی کیا دنیا ختم ہو گئی ہے۔ دفع کرو زندگی کو نئے سرے سے شروع کرو۔ دنیا میں بس وہی تو نہیں تھی۔''

''ہاں پچھلے ڈیڑھ سال سے میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔'' گالوں پر گرنے والے گرم قطروں کی تعداد میں اب اضافہ ہو گیا تھا۔ اسٹیریو پر آواز ابھی بھی گونج رہی تھی۔

This world has lost its glory
Let`s start a brand new story
Now my love

''اور پرسوں یہاں آنے کے بعد آج تمہیں دیکھا اور بس۔ سب کچھ دھواں بن کر اڑ گیا۔ مجھے پتا چل گیا تھا۔ تم بھی شادی اٹینڈ کرنے آئی ہو مگر میں کوشش کے باوجود تمہیں دیکھ نہیں پایا۔ پھر جب سب مہندی لے کر آ رہے تھے تو میں وہاں کھڑا ہو گیا۔ میرا خیال تھا تم اب تو نظر آؤ گی مگر تم نظر نہیں آئیں۔ میں نے ایک ایک چہرے کو دیکھا تھا۔ تم اندر کیسے چلی گئی تھیں؟''

''لان سے گزر کر۔'' اس نے گہرا سانس لیا۔

''ہاں مجھے اس کا خیال آیا تھا اور میں وہاں گیا تھا مگر تم نظر نہیں آئیں۔ میرا دل چاہا تھا میں کہیں بھاگ جاؤں پھر میں نے تمہیں ہال میں دیکھا تھا ثمین کے پاس۔ مجھے لگا تھا کسی نے مجھے زندگی بخش دی ہے اور پھر میں نے تمہیں وہاں اپنے کمرے میں دیکھا اور میرا دل چاہا تھا جنید مر جائے وہ یہاں کیوں کھڑا تھا۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا اور میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ تم نے کبھی الوژنز دیکھے ہیں موی؟ میں ڈیڑھ سال سے الوژنز کے حصار میں ہوں اور ابھی جو یہاں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں تو مجھے لگتا ہے میں پھر کسی الوژن کیساتھ چل رہا ہوں۔''

You think that I don`t even mean
A single word I say
It`s only words and words are all I have
To take your heart away

اسٹیریو کی آواز اب دور ہو چکی تھی مگر وہ اب بھی لفظوں کو سن سکتی تھی۔ وہ رک گئی۔ بارش تیز ہو چکی تھی۔ وہ دونوں بری طرح بھیگ چکے تھے۔

''ثمین؟'' اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

''وہ سمجھ جائے گی ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا جو کسی دوسرے سے محبت کرتا ہو۔ وہ جانتی ہے' میں کس سے محبت کرتا ہوں۔ پہلے تو شاید میں اس سے شادی کر لیتا مگر اب نہیں۔ سب کچھ جاننے کے بعد نہیں۔''

اس نے مڑ کر گیٹ کی طرف دیکھا تھا پھر اس نے گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیا۔

''میں نے طوطوں کے پنجرے کی جالی بدلوا دی تھی۔ اب اگر تم انہیں دیکھو۔ میرا مطلب

ہے روز تو وہ تمہاری انگلی کو کاٹ نہیں سکیں گے۔"

اس نے مڑ کر ولید کو دیکھا۔

Talk in ever lasting words
And dedicate them all to me
And I will give you all my life
I`m here if you should call to me

اسٹیریو پر بجنے والا نمبر ختم ہو گیا۔ چاروں طرف عجیب سا سناٹا پھیل گیا۔ بارش کے قطرے گرنے کی آواز اس خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی' پھر ولید نے اسے مسکراتے دیکھا تھا۔ وہ ایک قدم چل کر اس کے پاس آئی تھی۔ پاس آ کر اس نے اپنی بند مٹھی اس کے سامنے کر کے کھول دی۔ چیونگم کی ایک اسٹک ریپر سمیت ٹیڑھی میڑھی حالت میں اس کی مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ لہرائی۔ اس نے چیونگم اٹھالی۔ موی نے اسے کہتے سنا۔

"یہ دنیا کی سب سے قیمتی چیونگم ہے۔" وہ تیزی سے گیٹ کھول کر اندر آ گئی تھی۔ وہ وہیں باہر کھڑا چاروں طرف پھیلی ہوئی خاموشی اور برش کے قطروں کی آواز کو محسوس کرتا رہا۔

اس نے کلائی سے رسٹ واچ اتار کر وقت دیکھا تھا۔ نو بج کر سینتیس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے گھڑی کو اسی وقت پر روک دیا۔ ٹشو نکال کر اس نے چیونگم اور گھڑی دونوں کو اس میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔ ایک گہری سانس لے کر دونوں ہاتھوں سے گیلے بالوں کو ماتھے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا۔ وہاں مکمل تاریکی تھی۔ بارش کے قطرے اس کے چہرے پر گرنے لگے۔ اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"میرے علاوہ کسی کو آج یہ آسمان روشن نظر نہیں آ رہا ہوگا۔" اس نے واپس جاتے ہوئے سوچا۔

"ہاں یا پھر......" اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

پیرِ کامل

سین 5

لاہور کی حدود میں داخل ہوتے ہی امامہ نے اس سے کہا۔ "اب تم مجھے کسی بھی اسٹاپ پر اُتار دو...... میں چلی جاؤں گی۔"

"تم جہاں جانا چاہتی ہو' میں تمہیں وہاں چھوڑ دیتا ہوں۔ اتنی دھند میں کسی ٹرانسپورٹ کا انتظار کرتے تمہیں بہت وقت لگے گا۔" سڑکیں اس وقت تقریباً ویران تھیں' حالانکہ صبح ہو چکی تھی مگر دھند نے ہر چیز کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

"مجھے نہیں پتا' مجھے کہاں جانا ہے پھر تمہیں میں کس جگہ کا پتا بتاؤں۔ ابھی تو شاید میں ہاسٹل جاؤں گی پھر وہاں......" سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تو پھر میں تمہیں ہوسٹل چھوڑ دیتا ہوں۔" کچھ فاصلہ اسی طرح خاموشی سے طے ہوا پھر ہاسٹل سے کچھ فاصلے پر امامہ نے اس سے کہا۔

"بس تم یہاں گاڑی روک دو' میں یہاں سے خود چلی جاؤں گی...... میں تمہارے ساتھ ہاسٹل نہیں جانا چاہتی۔" سالار نے سڑک کے کنارے گاڑی روک دی۔

"پچھلے کچھ ہفتوں میں تم نے میری بہت مدد کی ہے' میں اس کے لئے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ تم میری مدد نہ کرتے تو آج میں یہاں نہ ہوتی۔" وہ ایک لمحہ کے لئے رکی۔

"تمہارا موبائل ابھی میرے پاس ہے' مگر مجھے ابھی اس کی ضرورت ہے' میں کچھ عرصہ بعد اسے واپس بھجوا دوں گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں' تم اسے رکھ سکتی ہو۔"

"میں کچھ دنوں بعد تم سے دوبارہ رابطہ کروں گی پھر تم مجھے طلاق کے پیپرز بھجوا دینا۔" وہ رکی۔ "میں اُمید کرتی ہوں کہ تم میرے پیرنٹس کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"یہ کہنے کی ضرورت تھی؟" سالار نے بھنویں اچکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ بتانا ہوتا تو میں بہت پہلے بتا چکا ہوتا۔" سالار نے قدرے سردمہری سے کہا۔ "تم مجھے بہت برا لڑکا سمجھتی تھیں' کیا ابھی بھی تمہاری میرے بارے میں وہی رائے ہے یا تم نے اپنی رائے میں کچھ تبدیلی کی ہے۔"

سالار نے اچانک تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے پوچھا۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ میں دراصل بہت اچھا لڑکا ہوں۔"

"ہوسکتا ہے۔" امامہ نے مدھم آواز میں کہا۔ سالار کو اس کی بات پر جیسے شاک لگا۔

"ہوسکتا ہے۔" وہ بے یقینی سے مسکرایا۔ "ابھی بھی ہوسکتا ہے۔ تم بہت ناشکری ہو امامہ' میں نے تمہارے لئے اتنا کچھ کیا ہے جو اس زمانے میں کوئی لڑکا نہیں کرے گا اور تم پھر بھی مجھے اچھا ماننے پر تیار نہیں۔"

"میں ناشکری نہیں ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم نے مجھ پر بہت احسان کئے ہیں اور شاید تمہاری جگہ کوئی دوسرا کبھی نہ کرتا......"

سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تو میں اچھا ہوا نا۔"

وہ کچھ نہیں بولی' صرف اسے دیکھتی رہی۔

"نہیں' ...... مجھے پتا ہے تم یہی کہنا چاہتی ہو' حالانکہ مشرقی لڑکی کی خاموشی اس کا اقرار ہوتی ہے مگر تمہاری خاموشی تمہارا انکار ہوتی ہے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔"

"ہم ایک فضول بحث کر رہے ہیں۔"

"ہوسکتا ہے۔" سالار نے کندھے اچکائے۔ "مگر مجھے حیرانی ہے کہ تم......"

اس بار امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم نے میرے لئے یقیناً بہت کچھ کیا ہے...... اور اگر میں تمہیں جانتی نہ ہوتی تو یقیناً میں تمہیں ایک بہت اچھا انسان سمجھتی اور کہہ بھی دیتی......مگر میں تمہیں اتنی اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ تم ایک اچھے انسان ہو......"

وہ رکی۔ سالار پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔

"جو آدمی خودکشی کی کوشش کرتا ہو' شراب پیتا ہو جس نے اپنا کمرہ عورتوں کی برہنہ تصویروں سے بھر رکھا ہو...... وہ اچھا آدمی تو نہیں ہوسکتا۔ امامہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"تم کسی ایسے آدمی کے پاس جاتیں جو یہ تینوں کام نہ کرتا مگر تمہاری مدد بھی نہ کرتا تو کیا تمہارے لئے وہ اچھا آدمی ہوتا؟" سالار نے تیز آواز میں کہا۔ "جیسے جلال انصر؟"

امامہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ "ہاں' اس نے میری مدد نہیں کی' مجھ سے شادی نہیں کی مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ برا ہو گیا ہے۔ وہ اچھا آدمی ہے...... ابھی بھی میرے نزدیک اچھا آدمی ہے۔"

"اور میں نے تمہاری مدد کی......تم سے شادی کی مگر یقیناً اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اچھا ہو گیا ہوں' میں برا آدمی ہوں۔" وہ عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے مسکرایا۔ "تمہارا خود اپنے بارے میں کیا خیال ہے امامہ......کیا تم اچھی لڑکی ہو؟"

اس نے اچانک چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگا۔

"میرے نزدیک تم بھی اچھی لڑکی نہیں ہو' تم بھی ایک لڑکے کے لئے اپنے گھر سے بھاگی ہو...... اپنے منگیتر کو دھوکہ دیا ہے تم نے ...... اپنی فیملی کی عزت کو خراب کیا ہے تم نے ......"

سالار نے ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے صاف گوئی سے کہا۔

امامہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آ گئی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو' میں واقعی اچھی لڑکی نہیں ہوں۔ ابھی مجھے یہ جملہ بہت سے لوگوں سے سننا ہے۔"

"میں تمہیں بہت لمبی چوڑی وضاحت دے سکتی ہوں مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں' تم ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتے۔"

"فرض کرو' میں تمہیں لاہور نہ لے کر آتا کہیں اور لے جاتا پھر ...... مگر میں تمہیں بحفاظت یہاں لے آیا...... یہ میرا تم پر کتنا بڑا احسان ہے' تمہیں اندازہ ہے اس کا۔"

امامہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے یقین تھا تم مجھے کہیں اور نہیں لے جاؤ گے۔"

وہ اس کی بات پر ہنسا۔ "مجھ پر یقین تھا...... کیوں؟ میں تو ایک برا لڑکا ہوں۔"

"مجھے تم پر یقین نہیں تھا......اللہ پر یقین تھا۔" سالار کے ماتھے پر کچھ بل پڑ گئے۔

"میں نے اللہ اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے سب کچھ چھوڑ دیا ہے' یہ کبھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ مجھے تمہارے جیسے آدمی کے ہاتھوں رسوا کرتے' یہ ممکن ہی نہیں تھا۔"

"فرض کرو ایسا ہو جاتا۔" سالار مصر ہوا۔ "میں ایسی بات کیوں فرض کروں جو نہیں ہوئی۔" وہ اپنی بات پر قائم تھی۔

"یعنی تم مجھے کسی قسم کا کوئی کریڈٹ نہیں دوگی۔" وہ مذاق اُڑانے والے انداز میں مسکرایا۔

"اچھا فرض کرو میں اب تمہیں جانے نہیں دیتا تو تم کیا کرو گی۔ گاڑی کا دروازہ جب تک میں نہیں کھولوں گا' نہیں کھلے گا...... یہ تم جانتی ہو......اب بتاؤ تم کیا کرو گی۔"

وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ "یا میں یہ کرتا ہوں۔" سالار نے ڈیش بورڈ پر پڑا ہوا اپ موبائل اُٹھایا اور اس پر ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔ "کہ تمہارے گھر فون کر دیتا ہوں۔" اس نے موبائل کی اسکرین کو اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ اس پر امامہ کے گھر کا نمبر تھا۔

"میں انہیں تمہارے بارے میں بتاتا ہوں کہ تم کہاں ہو' کس کے ساتھ ہو...... پھ یہاں سے تمہیں سیدھا پولیس اسٹیشن لے جا کر ان کی تحویل میں دے دیتا ہوں ......تو پھر تمہارے اعتقاد اور اعتبار کا کیا ہوا۔" وہ مذاق اُڑانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

امامہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ سالار کو بے حد خوشی محسوس ہوئی۔ سالار نے موبائل آف کرتے ہوئے ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"کتنا بڑا احسان کر رہا ہوں میں تم پر کہ ایسا نہیں کر رہا۔" اس نے موبائل کو دوبارہ ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "حالانکہ تم بے بس ہو' کچھ بھی نہیں کر سکتیں' اسی طرح رات کو میں تمہیں کہیں اور لے جاتا تو تم کیا کر لیتیں۔"

"میں تمہیں شوٹ کر دیتی۔" سالار نے حیرانی سے اسے دیکھا پھر قہقہہ مار کر ہنسا۔

"کیا کر دیتیں۔ میں...... تمہیں......شوٹ...... کر...... دیتی۔"

اس نے اسی انداز میں رک رک کر اس سے کہا۔ وہ اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھلکھلا کر ہنسا۔

"کبھی زندگی میں پسٹل دیکھا بھی ہے تم نے۔" اس نے امامہ کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

سالار نے اسے جھکتے اور اپنے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھا۔ جب وہ سیدھی ہوئی تو اس نے سالار سے کہا۔ "شاید اسے کہتے ہیں۔"

سالار ہنسنا بھول گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چھوٹے سائز کا ایک بہت خوب صورت اور قیمتی لیڈیز پستول تھا۔ سالار پستول پر اس کے ہاتھ کی گرفت دیکھ کر جان گیا تھا کہ وہ کسی اناڑی کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اس نے بے یقینی سے امامہ کو دیکھا۔

"تم مجھے شوٹ کر سکتی تھیں؟"

"ہاں' میں تمہیں شوٹ کر سکتی تھی مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ تم نے مجھے کوئی دھوکا نہیں دیا۔" اسنے مستحکم آواز میں کہا۔ اس نے پستول سالار کی طرف نہیں کیا تھا' صرف اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔

"گاڑی کا لاک......" اس نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے سالار سے کہا۔ سالار نے غیر ارادی طور پر اپنی طرف موجود بٹن دبا کر لاک کھول دیا۔ امامہ نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اب پستول اپنی گود میں موجود بیگ میں رکھ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان مزید کوئی بات نہیں ہوئی۔ امامہ نے گاڑی سے باہر نکل کر اس کا دروازہ بند کر دیا۔ سالار نے اسے تیز قدموں کے ساتھ ایک قریب آتی ہوئی وین کی طرف جاتے اور پھر اس میں سوار ہوتے دیکھا۔

ایمان اُمید اور محبت

سین 6

اگلے روز عقیلہ نے شام کو اسے خود تیار کرنا شروع کیا تھا۔ وہ جیسے اس کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی تھی۔ آٹھ بجے عقیلہ کا موبائل بجنے لگا۔ امید کا دل ڈوبنے لگا۔

"ہاں' وہ آ رہی ہے۔" عقیلہ نے جہاں زیب سے بات کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

"وہ گیٹ پر تمہارا انتظار کر رہا ہے جاؤ۔" وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ ہاسٹل کے لان تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کہیں جلنے والی روشنیاں تاریکی کو مکمل طور پر ختم کرنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔ دور ہاسٹل کا بند گیٹ اس وقت اسے ایک بھوت کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔

"کیا میں واقعی جانتی ہوں کہ میں کیا گنوانے جا رہی ہوں اور اگر میں یہ گیٹ کراس نہیں کرتی تو......تو کیا میں اس شخص کے بغیر رہ پاؤں گی۔"

اس نے قدم بڑھانے کی کوشش کی۔

"تو امید عالم! تم آج وہ کرنے جا رہی ہو' جس پر تمہارا باپ اپنی زندگی میں خودکشی کر لیتا۔ کیا ساری عمر وہ اس لیے تمہاری انگلی پکڑ کر تمہیں چلاتا رہا ہے کہ سامنے گڑھا آنے پر تم آنکھیں بند کر کے اس میں کود جاؤ۔ کیا اپنے باپ کی آواز کا نقش اتنا پھیکا تھا۔؟"

اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ "مگر میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ میں نے اس شخص سے اتنی محبت کی ہے کہ اب اس کے بغیر رہنا میرے لیے ممکن ہی نہیں۔" اس نے اپنے گالوں پر نمی محسوس کی۔

"مسلمان ہو کر تم وہ کرنے جا رہی ہو جو...... امید! کیا تم اللہ کا سامنا کر پاؤ گی۔"

اس نے اپنے وجود میں سے ساری ہمت نچڑتی پائی تھی۔ "مگر اللہ جانتا ہے میں مجبور ہوں اور وہ معاف بھی تو کر دیتا ہے کیا مجھے معاف نہیں کرے گا؟"

اس نے دل کو دلیل سے سمجھانا چاہا۔

"اور اگر اللہ نے اس گناہ کے لئے تمہیں معاف نہ کیا تو؟"

اسے اپنے پیروں میں زنجیریں پڑتی محسوس ہوئیں۔ "اور پاکیزگی تو صرف اللہ ہی عطا کرتا ہے۔"

اپنے باپ کی اکثر سنائی جانے والی ایک آیت کا ترجمہ اسے لرزا گیا۔

"تو کیا میں پاکیزگی کو چھوڑ کر اپنے وجود کو گندگی میں دھکیلنے جا رہی ہوں۔ مگر اللہ جانتا ہے میں مجبور ہوں۔" اس نے اپنے ملامت کرتے ہوئے ضمیر کو ایک اور بہانا پیش کیا۔

"تمہیں اللہ سے خوف کیوں نہیں آتا امید ......؟ گناہ کو پہچاننے کے باوجود تم اس کی طرف جانا چاہتی ہو اور تمہیں آس ہے کہ وہ تمہیں معاف کر دے گا۔ دین میں صرف دو راستے ہوتے ہیں اچھائی کا یا برائی کا۔ گناہ کا یا ثواب کا۔ تم کون سا تیسرا راستہ ڈھونڈنے جا رہی ہو۔ گناہ کرنے سے پہلے ہی خود کو بخشوا لینا چاہتی ہو کیا اس طرح تمہارا گناہ ثواب میں بدل جائے گا۔"

اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ سامنے نظر آنے والا گیٹ یک دم ہی بہت دور نظر آنے لگا تھا۔

"کیا میں بھی ان لڑکیوں میں سے ہو جاؤں جو...... ایک طوائف اور مجھ میں کیا فرق رہ جائے گا' وہ روپے کے لیے اور میں' میں محبت کے لیے ......"

اس کی کنپٹی میں درد کی ایک لہر گزر گئی تھی۔

"محبت کی اتنی بڑی قیمت دینے کے بعد میرے پاس تو اپنا وجود بھی نہیں رہ جائے گا کیا مذہب' کیا خدا' کیا Morality میری اوقات تو ایک کھوٹے سکے جتنی بھی نہیں رہ جائے گی۔ میرا باپ اپنی ساری عمر جس وجود پر آیات پڑھ پڑھ کر پھونکتا رہا اسے میں گندگی میں کیسے جھونک دوں۔ اتنے سال پانچ وقت کی نمازوں میں اپنے لیے پاکیزگی اور ہدایت کی دعائیں مانگتے رہنے کے بعد اب میں کہاں جا رہی ہوں کیا اللہ نے میرے دل پر مہر لگا دی ہے یا اس گیٹ کو کراس کرنے کے بعد مہر لگا دے گا۔"

اسے بے تحاشا خوف آیا۔ اس کا پورا وجود زنجیروں میں قید ہوتا جا رہا تھا۔

"باہر وہ شخص ہے جس سے بڑھ کر میں نے کسی کو نہیں چاہا تو اندر عافیت ہے' امان ہے اور ایمان ہے۔ اس چار دیواری کو پار کرنے کے بعد محبت مل جائے گی مگر ایمان ......"

اس کی کنپٹیاں درد سے پھٹ رہی تھیں۔ خالی نظروں سے اس نے سامنے گیٹ کو دیکھا پھر اپنے پیچھے مڑ کر ہاسٹل کی عمارت کو دیکھا۔

"جب تم حیا نہ کرو تو جو چاہے کرو۔"

اپنے باپ کے منہ سے بہت بار سنی جانے والی حدیث اسے یاد آئی تھی۔

اس نے گیٹ کو ایک بار پھر دیکھا ...... فیصلہ ہو گیا تھا ...... سرد وجود کے ساتھ وہ لان کے ایک تاریک کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے بالوں میں لگا ہوا کلپ اتار دیا۔ بیگ میں سے ٹشو نکال کر اس نے ہونٹ صاف کر دیے۔ اپنے ہاتھوں اور گلے میں پہنی ہوئی جیولری ایک ایک کر کے اس نے بیگ میں ڈال دی۔ اپنے ہاتھ میں پہنی ہوئی منگنی کی انگوٹھی کو اس نے آخری بار دیکھا پھر اسے اتار دیا۔

زندگی میں کبھی اس نے اتنی خاموشی' اتنی تاریکی' اتنی گھٹن نہیں دیکھی تھی جتنی اس رات لان کے اس تاریک کونے میں بیٹھ کر محسوس کی تھی۔ اسے یاد نہیں' وہ وہاں کتنی دیر بیٹھی رہی تھی۔ خشک آنکھوں اور خالی نظروں کے ساتھ اس نے لان کی روشوں پر چلتی لڑکیوں کو آہستہ آہستہ غائب ہوتے دیکھا تھا۔ رات کی تاریکی بڑھتی گئی تھی۔ پھر لان میں مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے کمرے کی طرف واپس جانے کے بجائے وہ گیٹ کی طرف گئی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ گیٹ کے دوسری طرف اب وہ نہیں ہوگا نہ ہی دوبارہ کبھی آئے گا۔ دور سے کسی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت وہ گیٹ کو دیکھتی رہی پھر واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ عقیلہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جن نظروں سے اسے دیکھا تھا ان میں کیا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ وہ جہاں زیب کے فون کرنے پر اسے پورے ہوسٹل میں تلاش کرتی پھری ہوگی وہ اس بات سے بھی واقف تھی اور اب شاید وہ امید کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی ہوگی۔ عقیلہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب دوبارہ پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ امید نے خاموشی سے اپنے کپڑے بدلے اور اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔

پیرِ کامل

سین 7

سیڑھیاں اب بھی اسی طرح تاریک تھیں مگر اس بار وہ جس ذہنی حالت میں تھا اسے کسی دیوار' کسی سہارے' کسی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اندھا دھند ان تاریک سیڑھیوں سے نیچے بھاگا اور بری طرح گرا۔ اگر سیڑھیاں سیدھی ہوتیں تو وہ سیدھا نیچے جا کر گرتا مگر سیڑھیوں کی گولائی نے اسے بچا لیا تھا۔ وہ اندھیرے میں ایک بار پھر اُٹھا۔ گھٹنوں اور ٹخنوں میں اٹھنے والی ٹیسوں سے بے پروا اس نے دوبارہ اسی طرح بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اُترنے کی کوشش کی۔ چند سیڑھیاں اُترنے کے بعد لگائی جانے والی چھلانگ نے اسے پھر زمین بوس کیا تھا۔ اس بار اس کا سر بھی دیوار سے ٹکرایا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اس کی ہڈی نہیں ٹوٹی۔ شاید سیڑھیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تو وہ پھر تیسری بار اٹھ کر اسی طرح سیڑھیاں اُترنے کی کوشش کرتا لیکن دوسری بار سیڑھیوں سے گرنے کے بعد وہ نیچے والی سیڑھیوں پر آ گیا تھا۔ سامنے گلی کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ سیڑھیوں سے نکل آیا مگر آگے نہیں جا سکا۔ چند قدم آگے چل کر اس گھر کے باہر تھڑے پر بیٹھ گیا۔ اسے متلی محسوس ہو رہی تھی۔ سر کو تھامتے ہوئے بے اختیار اسے ابکائی آئی وہ تھڑے پر بیٹھے بیٹھے جھک گیا' وہ ابکائیاں کرتے ہوئے بھی اسی طرح رو رہا تھا۔ گلی میں سے گزرنے والے لوگوں کے لئے یہ سین نیا نہیں تھا۔ یہاں بہت سے شرابی اور نشئی ضرورت سے زیادہ نشہ استعمال کرنے کے بعد یہی سب کچھ کیا کرتے تھے۔ صرف سالار کا لباس اور حلیہ تھا جو اسے کچھ مہذب دکھا رہا تھا اور اس کے آنسو اور واویلا' کسی طوائف کی بے وفائی کا نتیجہ تھا شاید۔ وہاں کئی بار کئی مرد ایسے ہی مہذب اور معزز نظر آنے والے مرد اسی طرح روتے ہوئے جاتے تھے۔ طوائف کا کوٹھا ہر کسی کو راس نہیں آتا۔ گزرنے والے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ کوئی اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ اس بازار میں حال احوال جاننے کا رواج نہیں تھا۔

عاکف نیچے نہیں آیا تھا۔ آتا تو شائید سالار کے پاس رک جاتا۔ امامہ ہاشم وہاں نہیں تھی۔ صنوبر' امامہ ہاشم نہیں تھی۔ کتنا بڑا بوجھ اس کے کندھوں سے اُٹھا لیا گیا تھا' کیسی اذیت سے اسے بچا یا گیا تھا۔ تکلیف دے کر اسے آگہی نہیں دی گئی۔ صرف تکلیف کا احساس دے کر اسے

آگہی سے شناسا کر دیا گیا تھا۔ اسے وہاں نہ دیکھ کر وہ اس حالت میں جا پہنچا تھا۔ وہ اسے وہاں دیکھ لیتا تو اس پر کیا گزرتی۔ اسے اللہ سے خوف آ رہا تھا بے پناہ خوف۔ وہ کس قدر طاقتور تھا کیا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کس قدر مہربان تھا۔ کیا نہیں کرتا تھا۔ انسان کو انسان رکھنا اسے آتا تھا۔ کبھی غضب سے' کبھی احسان سے۔ وہ اسے اس کے دائرے میں ہی رکھتا تھا۔

اسے کبھی اپنی زندگی کے اس سیاہ باب پر اتنا پچھتاوا' اتنی نفرت نہیں ہوئی جتنی اس وقت ہو رہی تھی......

''کیوں؟ کیوں...... ؟ کیوں آتا تھا میں یہاں پر...... ؟ کیوں خریدتا تھا میں ان عورتوں کو...... ؟ کیوں گناہ کا احساس میرے اندر نہیں جاگتا تھا؟ وہ چبوترے پر بیٹھا دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بلک رہا تھا۔

''اور اب...... اب جب میں یہ سب کچھ چھوڑ چکا ہوں تو اب...... اب کیوں...... یہ تکلیف...... یہ چبھن ہو رہی ہے مجھے۔ میں جانتا ہوں۔ جانتا ہوں مجھے اپنے ہر عمل کے لئے جواب دہ ہونا ہے' مگر یہ حساب یہاں...... اس طرح نہ لے۔ جس عورت سے میں محبت کرتا ہوں اسے کبھی اس بازار میں نہ پھینک۔''

وہ روتے روتے رُکا' کون سا انکشاف کہاں ہو رہا تھا۔

''محبت؟'' وہ گلی سے گزرتے لوگوں کو دیکھتے ہوئے بے یقینی سے بڑبڑایا۔

''کیا میں...... میں اس سے محبت کرتا ہوں؟'' کوئی لہر اس کے سر سے پیروں تک گزری تھی۔

''کیا یہ تکلیف صرف اس لئے ہو رہی ہے مجھے کہ میں اس سے......'' اس کے چہرے پر سائے لہرائے تھے۔ ''کیا وہ میرا پچھتاوا نہیں ہے۔ کچھ اور ہے......؟''

اسے لگا وہ وہاں سے کبھی اُٹھ نہیں پائے گا۔

''تو یہ پچھتاوا نہیں محبت ہے' جس کے پیچھے میں بھاگتا پھر رہا ہوں۔'' اسے اپنا جسم بت کا بنا ہوا لگا۔

''امامہ پھانس نہیں ہے روگ ہے؟'' آنسو اب بھی اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔''

''اور اس بازار میں اس عورت کی تلاش میں اُٹھتے میرے قدموں میں لرزش اس لئے تھی کیونکہ میں نے اسے اپنے دل کے بہت اندر کہیں بہت اونچی جگہ پر رکھا تھا۔ وہاں' جہاں خود میں بھی اس کو محسوس نہیں کر پا رہا تھا۔ چیک میٹ۔''

''150+ آئی کیو لیول کا وہ مرد منہ کے بل زمین پر گرایا گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کون سا زخم تھا جو وہاں بیٹھا ہرا ہو رہا تھا۔ کون سی تکلیف تھی جو سانس لینے نہیں

دے رہی تھی۔ آئینے نے اسے کہاں برہنہ کیا تھا۔ اسے کیا دیا تھا؟ کیا لیا تھا؟ وہ اٹھ کر وہاں سے چلنے لگا۔ اسی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے۔ اسے خود پر قابو نہیں تھا۔ اسے پاس سے گزرنے والوں کی نظروں کی بھی پروا نہیں تھی۔ اسے اپنے وجود سے کبھی زندگی میں اتنی نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت ہو رہی تھی۔ وہ ریڈلائٹ ایریا اس کی زندگی کا سب سے سیاہ باب تھا۔ ایسا سیاہ باب جسے وہ کھرچ کر اپنی زندگی سے علیحدہ نہیں کر پایا تھا۔ وہ ایک بار پھر اس کی زندگی میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کئی سال پہلے وہاں گزاری گئی راتیں اب بلاؤں کی طرح اسے گھیرے ہوئے تھیں اور وہ ان سے فرار حاصل نہیں کر پا رہا تھا اور اب جس خوف نے اسے اپنے حصار میں لیا تھا وہ تو......

''اگر...... اگر...... امامہ اس بازار میں آ گئی ہوتی تو......؟ صنوبر' امامہ ہاشم نہیں تھی مگر کوئی اور......'' اس کے سر میں درد کی ایک اور لہر اٹھی۔ میگرین اب شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا وہ راستے کو بھی ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ اب اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا پھر وہ کہیں بیٹھ گیا تھا۔ گاڑیوں کے ہارن اور لائٹس نے اس کے درد کو اور بڑھایا تھا پھر اس کا ذہن کسی تاریکی میں۔

......✿......

امربیل

سین 8

''ہیلو علیزہ!'' دوسری طرف سے صالحہ کہہ رہی تھی۔

''ہیلو۔''

علیزہ نے گاڑی کے لاک کو چیک کرتے ہوئے کہا۔ اس کی نظر اب بھی اس ایمبولینس پر تھی جو رک گئی تھی مگر اس کے اردگرد پولیس اہلکاروں کا ایک لمبا چوڑا ہجوم تھا۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اس میں عمر ہو گا۔ وہ کچھ مضطرب سی ہو گئی۔

''آئی ایم سوری۔'' دوسری طرف سے اس نے صالحہ کو کہتے سنا۔

''کس لیے؟'' وہ صالحہ کی بات پر کچھ حیران ہوئی۔ اس کی نظر اب بھی ایمبولینس پر تھی جس کا پچھلا دروازہ اب کھل چکا تھا۔

''عمر جہانگیر کی ڈیتھ کے لیے...... یقین کرو...... مجھے واقعی افسوس ہے۔'' موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔

''ڈیتھ۔'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''میرے خدا۔'' وہ ایمبولینس سے نکالے جانے والے اسٹریچر کو دیکھ رہی تھی۔

اسٹریچر پر موجود سفید چادر جگہ جگہ سے خون آلود تھی۔

فوٹوگرافرز کی فلیش لائٹس......

اسٹریچر کے ساتھ چلتا ہوا عباس......

اس کے بہت سارے دوسرے کزنز......

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا...... دوسرا...... تیسرا...... اور پھر اس نے خود کو بھاگتے پایا تھا۔

پاگلوں کی طرح ہجوم کو کاٹتے......

ایک پولیس والے نے اسے روکنے کی کوشش کی' اس نے پوری قوت کے ساتھ اس کو دھکا دیا...... پھر اس کے کسی کزن نے اسے دیکھ لیا تھا اور دوبارہ کسی نے اسے نہیں روکا۔

وہ بھاگتی ہوئی اسٹریچر کے سامنے آئی تھی۔ عباس نے اسے دیکھا تو اسٹریچر پر رکھا ہوا

ہاتھ ہٹا لیا اور چند قدم تیزی سے چلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ علیزہ کے گرد اپنا بازو پھیلاتے ہوئے اسے ایک طرف کیا تھا۔

اسٹریچر کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی' وہ اسی تیزی کے ساتھ اس کے سامنے سے گزر گیا...... وہ اس کے اتنے قریب سے گزرا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ چھو سکتی تھی۔ سفید چادر جہاں سب سے زیادہ خون آلود تھی' وہ اس کا سر اور چہرہ ہی ہو سکتا تھا...... لیکن وہ ہاتھ نہیں بڑھا سکی۔

وہ یہ یقین ہی نہیں کر سکتی تھی کہ اس اسٹریچر پر' اس حالت میں...... اس سفید چادر سے ڈھانپا ہوا وجود عمر کا ہو سکتا ہے......

عمر جہانگیر کا......

اس کی نظروں نے آپریشن تھیٹر تک اسٹریچر کا تعاقب کیا پھر اس نے گردن موڑ کر پہلی بار عباس کا چہرہ دیکھا۔

''عمر۔'' اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر حلق سے آواز نہیں نکلی۔ صرف ہونٹوں میں جنبش ہوئی تھی' عباس نے شکست خوردہ انداز میں سر ہلایا۔ وہ بے یقینی سے اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

ایک فوٹو گرافر نے ان دونوں کی تصویر کھینچی...... فلیش لائٹ چمکنے پر اس نے عباس کو غضب ناک ہوتے دیکھا۔

''اس باسٹرڈ سے کیمرہ لے کر...... دھکے دے کر اسے یہاں سے نکالو۔'' وہ اب کسی سے کہہ رہا تھا۔

علیزہ نے چند پولیس والوں کو اس فوٹو گرافر کی طرف بڑھتے دیکھا۔

''عباس کو غلط فہمی ہوئی ہوگی' یہ عمر نہیں ہوگا' کوئی اور ہوگا۔ عمر اس طرح کیسے......''

ماؤف ذہن کے ساتھ اس نے آپریشن تھیٹر کے بند دروازے کو دیکھا۔

اس نے عباس کے بازو کو اپنے کندھے سے ہٹانے کی کوشش کی' وہ عمر کو اس کے موبائل پر رنگ کرنا چاہتی تھی۔

اسے یاد آیا' اس کے پاس نہ اس کا بیگ تھا' نہ فون...... گاڑی کی چابی تک نہیں تھی۔

''علیزہ! اس کمرے میں چلی جاؤ' تانیہ وہاں ہے۔ میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔'' عباس اسے ایک طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔

''مجھے موبائل دیں' مجھے فون کرنا ہے۔'' وہ اب کسی دوسرے کوریڈور میں تھی' اس کا ایک اور کزن خضر علی ان کے ساتھ تھا وہ اور عباس کچھ کہہ رہے تھے۔ علیزہ کے لیے ان کی باتوں کو سمجھنا

مشکل ہو رہا تھا۔

ان کے ساتھ چلتے ہوئے وہ اب کسی کمرے میں داخل ہو گئی' وہاں تانیہ تھی اور اس کی فیملی کی چند دوسری خواتین بھی۔

''پلیز' فون دیں۔'' اس نے کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''کس کو فون کرنا ہے' میں کر دیتا ہوں۔'' عباس نے نرمی سے کہا۔

''عمر کو......''

عباس نے تانیہ کو اشارہ کیا۔ ''Just take care of her'' (اسے سنبھالو)

تانیہ نے نرمی سے اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے جانے کی کوشش کی۔ وہ یکدم مشتعل ہوئی' اس نے درشتی سے تانیہ کا بازو جھٹکا۔

''میں آپ سے فون مانگ رہی ہوں...... اور آپ میری بات نہیں سن رہے۔'' عباس باہر جاتے جاتے رک گیا۔ علیزہ کی آواز بے حد بلند تھی۔ عباس نے ایک نظر دروازے کے باہر موجود ہجوم پر ڈالی۔

''خضر! تم چلو' میں آتا ہوں۔'' اس نے ساتھ کھڑے خضر سے کہا اور اس کے باہر نکلتے ہی دروازے کو آہستگی سے بند کر دیا۔

''مجھے فون دیں۔'' علیزہ ایک بار پھر غرائی۔ ''میں اسے فون کرنا چاہتی ہوں۔''

''جسے تم فون کرنا چاہتی ہو' وہ اب نہیں ہے...... پلیز تم......''

اس نے عباس کی بات کاٹ دی۔

''میری بات کروا دیں اس سے...... پلیز عباس بھائی! بات کروا دیں۔ آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہے' عمر کو کچھ نہیں ہوا۔ اسے کچھ نہیں ہو سکتا۔'' اس بار اس کی آواز میں بے چارگی تھی۔

''اس کے پاس اتنی سیکورٹی ہوتی ہے' اسے کچھ کیسے ہو سکتا ہے' آپ خود سوچیں نا۔ کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے عباس بھائی۔'' وہ بے ربط جملے بول رہی تھی۔

کیا کہہ رہی تھی' نہیں جانتی تھی۔ کیا کہنا چاہتی تھی' اس سے بھی بے خبر تھی۔

عباس کے چہرے کی تھکن اور شکستگی اس کے خوف میں اضافہ کر رہی تھی مگر خوف......؟

''کیا خوف تھا اسے؟ بے یقینی؟ کیسی بے یقینی تھی؟

عباس نے اس بار کچھ نہیں کہا' وہ ایک ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔ علیزہ کی نظر پہلی بار اس کے بائیں ہاتھ میں پڑے سیلڈ پیکٹ پر پڑی جس کی سیل وہ اب کھول رہا تھا۔ پیکٹ کی سیل کھولنے کے بعد اس میں موجود چیزوں کو آہستگی سے ٹیبل پر الٹ دیا۔

وہ عمر کا موبائل' گلاسز' سگریٹ کیس' لائٹر' گھڑی' والٹ اور چند دوسری چیزیں تھیں۔ وہ

کچھ چیزوں کو پہچانتی تھی' کچھ کو نہیں پہچانتی تھی۔ کچھ بھی کہے بغیر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے وہ میز کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ میز پر پڑی ہوئی چیزوں میں سے کچھ خون آلودہ تھیں' وہ ان چیزوں کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں کر سکی۔ بس دونوں ہاتھ میز پر رکھے یک ٹک انہیں دیکھتی رہی۔

وہ سب چیزیں کبھی اس شخص کی زندگی کا ایک حصہ تھیں جسے وہ اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتی تھی۔

ان سب چیزوں پر اس شخص کے ہاتھوں کا لمس تھا جسے اس نے دنیا میں سب سے زیادہ چاہا تھا۔ عمر جہانگیر ختم ہو چکا تھا' سامنے پڑا ہوا موبائل فون اب کبھی بھی عمر کے ساتھ اس کا رابطہ نہیں کروا سکتا تھا۔

اس نے وہیں بیٹھ کر ٹیبل پر اپنا سر ٹکا دیا اور مٹھیاں بھینچ کر روتی چلی گئی۔

''میں نے کبھی اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اس طرح چلا جائے۔'' وہ بے تحاشا رو رہی تھی' بچوں کی طرح' جنونی انداز میں۔

اس لمحے اس پر پہلی بار انکشاف ہوا تھا کہ اسے عمر سے کبھی نفرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ عمر سے نفرت کر ہی نہیں سکتی تھی صرف ایک دھوکا اور فریب تھا جو وہ اپنے آپ کو دے رہی تھی' صرف اس خواہش اور اس امید پر کہ شاید کبھی اسے عمر سے نفرت ہو جائے۔

کبھی...... کبھی...... شاید کبھی......

تانیہ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر سیدھا کرنے کی کوشش کی' عباس ہونٹ بھینچے ان تمام چیزوں کو ایک بار پھر اسی لفافے کے اندر ڈال رہا تھا۔

''جسٹ ریلیکس علیزہ! رونے سے وہ آ تو نہیں جائے گا۔'' تانیہ نے اس کے کندھوں پر کچھ دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

''میرے رونے سے تو آ جاتا تھا۔'' تانیہ کچھ کہہ نہیں سکی۔

''مجھے اس کے پاس جانا ہے...... میں اس کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔''

''اس کا پوسٹ مارٹم ہو رہا ہے علیزہ! میں کچھ دیر بعد تمہیں اس کے پاس لے جاؤں گا۔'' عباس نے اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے کہا۔

وہ بے بسی سے روتے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔ بہت سالوں کے بعد وہ یوں کسی کے سامنے رو رہی تھی۔ آنسوؤں کو روکنے کی کوئی ارادی یا غیر ارادی کوشش کیے بغیر۔

''تم کبھی مجبور نہیں ہو سکتیں علیزہ! تم کبھی مجبور نہیں ہو سکتی ہو۔'' اس حالت میں پہلی بار اسے عمر کی اس بات کا یقین آ رہا تھا بلکہ اس وقت یہاں بیٹھے اس کی ہر بات کا یقین آ رہا تھا۔

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ ''وہ جذباتی تھی' وہ مجبور تھی اور وہ عمر کے کسی بھی حصے میں ان دونوں

خامیوں سے نجات حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ کوئی عمر سے بہتر اسے نہیں جان سکتا تھا۔

عباس اب کمرے سے باہر جا رہا تھا۔ عباس کے جسم پر موجود یونیفارم نے اسے ایک بار پھر عمر کی یاد دلائی تھی۔ کیا کچھ تھا جو اب اسے اس کی یاد نہ دلاتا؟ وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔

''تو یہ ہوتی ہے زندگی

اور یہ محبت

ایک وقت میں ایک ہی چیز ختم ہوتی ہے' دونوں نہیں۔ اور اس وقت اس کے دل میں عمر کے لیے کوئی شکایت' کوئی گلہ' کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اور اب زندگی میں کبھی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

''فائرنگ کی تھی کسی نے۔ گاڑی میں اس کا ایک گارڈ اور ڈرائیور بھی مارا گیا۔ عباس کو اس ایکسیڈنٹ کی دس منٹ بعد ہی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ بہت اپ سیٹ تھا۔ یہاں سے خود ہیلی کاپٹر میں گیا تھا اس کی باڈی لانے کے لیے' میں کوشش کرتی رہی کہ تم لوگوں کو کسی طرح ٹریس آؤٹ کر لوں مگر نہیں کر سکی۔ خود عباس نے بھی بہت کوشش کی۔''

تانیہ دھیمی آواز میں ساتھ والی کرسی پر بیٹھی کہہ رہی تھی۔ علیزہ کے لیے یہ سب اطلاعات بے معنی تھیں۔

''وہ چند دنوں میں امریکہ جانے والا تھا ایکس پاکستان لیو پر' اور یہ سب کچھ ہو گیا۔''

علیزہ نے یک دم سر اٹھا کر دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس کو دیکھا۔

''تمہیں لگتا ہے' میں چلا جاؤں گا تو تمہارے اور جنید کے درمیان سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔؟ اگر ایسا ہے تو میں واقعی دوبارہ کبھی تم دونوں کے درمیان نہیں آؤں گا۔ میں جنید سے دوبارہ کبھی نہیں ملوں گا۔''

''تم کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟'' تانیہ نے اسے مخاطب کیا' علیزہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا لگ گیا تھا۔

''تم ہارڈ کور کریمنل ہو۔ بس فرق یہ ہے کہ تم نے یونیفارم پہنا ہوا ہے۔ جس دن یہ یونیفارم اتر جائے گا' اس دن تم بھی اسی طرح مارے جاؤ گے جس طرح تم دوسرے لوگوں کو مارتے ہو۔''

علیزہ نے شکست خوردگی کے عالم میں سر جھکا لیا۔

اس نے زندگی میں خود کو اس سے زیادہ کمزور اور قابل رحم کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

''وہ کتنی تکلیف سے گزرا ہو گا۔ کتنا درد برداشت کرنا پڑا ہو گا اسے۔'' وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کون کہتا ہے کہ کسی شخص سے ایک بار محبت ہونے کے بعد اس سے نفرت ہو سکتی ہے۔

جو کہتا ہے وہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹا ہے۔

Cycle of replacement میں صرف محبت کی replacement نہیں ہوتی۔ خود کو فریب دینے کے باوجود ہم جانتے ہیں کہ ہمارے وجود میں خون کی گردش کی طرح بسنے والا نام کس کا ہوتا ہے۔ ہم کبھی بھی اسے اپنے وجود سے نکال کر باہر نہیں پھینک سکتے۔ تہہ در تہہ اس کے اوپر دوسری محبتوں کا ڈھیر لگائے جاتے ہیں' کہتے جاتے ہیں۔ اب ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ اب ہم اُس سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن جو زیادہ دور ہوتا جاتا ہے وہ زیادہ قریب آتا جاتا ہے۔ اور وہ ہمارے دل اور دماغ کے اس حصّے میں جا پہنچتا ہے کہ کبھی اس کو وہاں سے نکالنا پڑے تو پھر اس کے بعد ہم نارمل زندگی گزارنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔

وہ اس کی محبت میں سولہ سال کی عمر میں گرفتار ہوئی تھی۔ وہ واحد شخص تھا جس سے وہ ہر بات کر لیتی تھی' بہت ساری وہ باتیں بھی جو وہ کبھی شہلا اور نانو سے بھی نہیں کر سکتی تھی۔

وہ واحد شخص تھا جو اس کے نخرے برداشت کرتا تھا۔ ناز اٹھاتا تھا۔ اس نے عمر جہانگیر کے علاوہ کسی سے اتنی ضد نہیں کی تھی۔ کسی کو اتنا تنگ نہیں کیا تھا۔ اس نے عمر جہانگیر کے علاوہ کسی کو بُرا بھلا بھی نہیں کہا تھا۔ کسی سے بدتمیزی بھی نہیں کی تھی۔ کسی پر چیخی چلائی بھی نہیں تھی۔

وہ واحد شخص تھا جو اس کی ہر غلطی اپنے کندھوں پر لینے کے لیے تیار رہتا تھا۔ جو اسے محفوظ رکھنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔ اور وہ یہ سب کچھ جانتی تھی۔

اور اب جب وہ اپنی زندگی کا سفر ختم کر کے دنیا سے جا چکا تھا تو وہ اندھوں کی طرح ہاتھ پھیلائے کھڑی رہ گئی تھی۔ کوئی دوسرا شخص اس کے لیے عمر جہانگیر نہیں بن سکتا تھا۔

دونوں ہاتھ سر پر رکھے وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی' بالکل اسی طرح جس طرح وہ سولہ سال کی عمر میں ایک بار عمر کے سامنے پارک میں روئی تھی اور پھر اس کے بعد اس کے سامنے کئی بار روئی تھی۔ کیا کچھ تھا جو آج اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اسے پہلی بار لگ رہا تھا جیسے سب کچھ ختم ہو گیا۔ سب کچھ...... کہیں بھی' کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

کیا تھا اگر وہ اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ پھر بھی اس کا ہونا ہی کتنا کافی تھا اس کے لیے۔

کچھ فاصلے پر موجود ایک کمرے میں عمر جہانگیر کے جسم کو کاٹنے والے سارے نشتر اسے اپنے وجود پر چلتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ اسے اپنی زندگی میں بہت سی تکلیف دہ چیزوں سے بچایا کرتا تھا۔ اور وہاں بیٹھے علیزہ سکندر کی خواہش اتنی تھی وہ اس سب کے بدلے عمر جہانگیر کو صرف ایک چیز سے بچا لے...... موت سے......

پیرِ کامل

سین 9

سالار اس دن ہمیشہ کی طرح ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ابھی اپنا لیکچر شروع نہیں کیا تھا جب ان کے پاس بیٹھے ایک ادھیڑ عمر آدمی نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! آدمی کو پیرِ کامل مل جائے تو اس کی تقدیر بدل جاتی ہے۔''

سالار نے گردن موڑ کر اس شخص کو دیکھا' وہ وہاں پچھلے چند دن سے آ رہا تھا۔

''اس کی نسلیں سنور جاتی ہیں۔ میں جب سے آپ کے پاس آنے لگا ہوں' مجھے لگتا ہے میں ہدایت پا گیا ہوں۔ میرے الٹے کام سیدھے ہونے لگے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ مجھے پیرِ کامل مل گیا ہے۔ میں...... میں آپ کے ہاتھوں پر بیعت کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ بڑی عقیدت مندی سے ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ پکڑے ہوئے کہنے لگا۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے نرمی سے اس شخص کے ہاتھ پر تھپکی دیتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''تقی صاحب! میں نے زندگی میں آج تک کسی سے بیعت نہیں لی۔ آپ کے منہ سے پیرِ کامل کا ذکر سنا...... پیرِ کامل کون ہوتا ہے...... پیرِ کامل کس کو کہتے ہیں...... وہ کیا کرتا ہے......؟ اس کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟''

وہ بڑی سنجیدگی سے اس شخص سے پوچھ رہے تھے۔

''آپ پیرِ کامل ہیں۔'' اس شخص نے کہا۔

''نہیں' میں پیرِ کامل نہیں ہوں۔'' ڈاکٹر سبط علی نے کہا۔

''آپ سے مجھے ہدایت ملتی ہے۔'' اس شخص نے اصرار کیا۔

''ہدایت تو استاد بھی دیتا ہے' ماں باپ بھی دیتے ہیں' لیڈرز بھی دیتے ہیں' دوست احباب بھی دیتے ہیں' کیا وہ پیرِ کامل ہو جاتے ہیں؟''

''آپ...... آپ گناہ نہیں کرتے۔'' وہ آدمی گڑبڑا گیا۔

''ہاں' دانستہ طور پر نہیں کرتا' اس لئے نہیں کرتا' کیونکہ گناہ سے مجھے خوف آتا ہے۔

یہاں پر بیٹھے بہت سے لوگ دانستہ طور پر گناہ نہیں کرتے ہوں گے' کیونکہ میری طرح انہیں بھی گناہ سے خوف آتا ہوگا مگر نادانستگی میں مجھ سے کیا سرزد ہو جاتا ہے' اسے میں نہیں جانتا۔ ہوسکتا ہے نادانستگی میں مجھ سے بھی گناہ سرزد ہو جاتے ہوں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کی دعا قبول ہوتی ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کی دعا قبول ہوتی ہے۔'' وہ آدمی اپنے موقف سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

''دعا تو ماں باپ کی بھی قبول ہوتی ہے' مجبور اور مظلوم کی بھی قبول ہوتی ہے اور بھی بہت سے لوگوں کی قبول ہوتی ہے۔''

''لیکن آپ کی تو ہر دعا قبول ہو جاتی ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔

ڈاکٹر سبط علی صاحب نے انکار میں سر ہلایا۔

''نہیں' ہر دعا تو قبول نہیں ہوتی۔ میں کئی سالوں سے ہر روز مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی دعا کرتا ہوں' ابھی تک تو قبول نہیں ہوئی۔ ہر روز میری کی جانے والی کئی دعائیں قبول نہیں بھی ہوتیں۔''

''لیکن آپ کے پاس جو شخص دعا کروانے کے لئے آتا ہے' اس کے لئے آپ کی دعا ضرور قبول ہو جاتی ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

''آپ کے لئے کی جانے والی دعا قبول ہوگئی ہوگی' یہاں بہت سے ایسے ہیں جن کے لئے میری دعا قبول نہیں ہوتی یا نہیں ہوئیں۔''

وہ اب کچھ بول نہیں سکا۔

''آپ میں سے اگر کوئی بتا سکے کہ پیرِ کامل کون ہوتا ہے؟''

وہاں موجود لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر ایک نے کہا۔

''پیرِ کامل نیک شخص ہوتا ہے' عبادت گزار شخص' پارسا آدمی۔''

ڈاکٹر سبط علی نے سر ہلایا۔

''بہت سے لوگ نیک ہوتے ہیں' عبادت گزار ہوتے ہیں' پارسا ہوتے ہیں۔ آپ کے اردگرد ایسے بہت سارے لوگ ہوتے ہیں تو کیا وہ سب پیرِ کامل ہوتے ہیں؟''

''نہیں' پیرِ کامل وہ آدمی ہوتا ہے جو دکھاوے کے لئے عبادت نہیں کرتا۔ دل سے عبادت کرتا ہے' صرف اللہ کے لئے۔ اس کی نیکی اور پارسائی ڈھونگ نہیں ہوتی۔'' ایک اور شخص نے اپنی رائے دی۔

''اپنے حلقہء احباب میں آپ میں سے ہر ایک کسی نہ کسی ایسے شخص کو ضرور جانتا ہوگا'

جس کی عبادت کے بارے میں اسے یہ شبہ نہیں ہوتا کہ وہ ڈھونگ ہے' جس کی نیکی اور پارسائی کا بھی آپ کو یقین ہوتا ہے تو کیا وہ شخص پیرِ کامل ہے؟''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایک اور شخص نے کہا۔

''پیرِ کامل ایک ایسا شخص ہوتا ہے' جس کے الفاظ میں تاثیر ہوتی ہے کہ وہ انسان کا دل بدل دیتے ہیں۔''

''تاثیر بھی بہت سے لوگوں کے الفاظ میں ہوتی ہے۔ کچھ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ میں' کچھ کے قلم سے نکلنے والے الفاظ میں' تاثیر تو اسٹیج پر کھڑے ایک کمپیئر اور اخبار کا کالم لکھنے والے ایک جرنلسٹ کے الفاظ میں بھی ہوتی ہے تو کیا وہ پیرِ کامل ہوتے ہیں؟''

ایک اور شخص بولا۔ ''پیرِ کامل وہ ہوتا ہے جسے الہام اور وجدان ہو' جو مستقبل کو بوجھ سکے۔''

''ہم میں سے بہت سارے لوگ ایسے خواب دیکھتے ہیں جن میں مستقبل میں درپیش آنے والے حالات سے ہمیں آگہی ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ استخارہ بھی کرتے ہیں اور چیزوں کے بارے میں کسی حد تک جان جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے' وہ خطروں کو بھانپ جاتے ہیں۔''

''پیرِ کامل کون ہوتا ہے؟'' ڈاکٹر صاحب کچھ دیر خاموش رہے' انہوں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''پیرِ کامل کون ہوسکتا ہے؟'' سالار الجھن آمیز انداز میں ڈاکٹر سبط علی کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

''کیا ڈاکٹر سبطِ علی کے علاوہ کوئی اور پیرِ کامل ہوسکتا تھا اور اگر وہ نہیں تھے تو پھر کون تھا اور کون ہوسکتا ہے؟''

وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے دل و دماغ میں ایک ہی گونج تھی۔ ڈاکٹر سبطِ علی ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہے تھے' پھر ان کے چہرے کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ معدوم ہوگئی۔

''پیرِ کامل میں کاملیت ہوتی ہے۔ کاملیت ان تمام چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو آپ کہہ رہے تھے۔ پیرِ کامل وہ شخص ہوتا ہے جو دل سے اللہ کی عبادت کرتا ہے' نیک اور پارسا ہوتا ہے۔ اس کی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ اس حد تک جس حد تک اللہ چاہے۔ اس کے الفاظ میں تاثیر بھی ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو ہدایت بھی دیتا ہے مگر اسے الہام نہیں ہوتا' اسے وجدان ہوتا ہے۔ وحی اُترتی ہے اس پر اور وحی کسی عام انسان پر نہیں اُترتی۔ صرف پیغمبر پر اُترتی ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کامل تھا مگر پیرِ کامل وہ ہے جس پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا جاتا ہے۔

ہر انسان کو زندگی میں کبھی نہ کبھی کسی پیرِ کامل کی ضرورت ضرور پڑتی ہے۔ کبھی نہ کبھی

انسانی زندگی اس موڑ پر آ کر ضرور کھڑی ہو جاتی ہے جب یہ لگتا ہے کہ ہمارے لبوں اور دل سے نکلنے والی دعائیں بے اثر ہو گئی ہیں۔ ہمارے سجدے اور ہمارے پھیلے ہوئے ہاتھ رحمتوں اور نعمتوں کو اپنی طرف موڑ نہیں پا رہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی تعلق تھا جو ٹوٹ گیا ہے پھر آدمی کا دل چاہتا ہے اب اس کے لئے کوئی اور ہاتھ اُٹھائے' کسی اور کے لب اس کی دعا اللہ تک پہنچائیں' کوئی اور اللہ کے سامنے اس کے لئے گڑگڑائے' کوئی ایسا شخص جس کی دعائیں قبول ہوتی ہوں' جس کے لبوں سے نکلنے والی التجائیں اس کے اپنے لفظوں کی طرح واپس نہ موڑ دی جاتی ہوں پھر انسان پیرِ کامل کی تلاش شروع کرتا ہے' بھاگتا پھرتا ہے' دنیا میں کسی ایسے شخص کے لئے جو کاملیت کی کسی نہ کسی سیڑھی پر کھڑا ہو۔

پیرِ کامل کی یہ تلاش انسانی زندگی کے ارتقاء سے اب تک جاری ہے۔ یہ تلاش وہ خواہش ہے جو اللہ خود انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ انسان کے دل میں یہ خواہش' یہ تلاش نہ اُتاری جاتی تو وہ پیغمبروں پر کبھی یقین نہ لاتا۔ کبھی ان کی پیروی اور اطاعت کرنے کی کوشش نہ کرتا۔

پیرِ کامل کی یہ تلاش ہی انسان کو ہر زمانے میں اُتارے جانے والے پیغمبروں کی طرف لے جاتی رہی پھر پیغمبروں کی مبعوثیت کا یہ سلسلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ختم کر دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی اور پیرِ کامل کی گنجائش نہیں رکھی گئی۔

کون ہے جسے اب یا آئندہ آنے والے زمانے میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کون مقام دیا جائے؟

کون ہے جسے آج یا آئندہ آنے والے زمانے میں کسی شخص کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کاملیت دے دی جائے؟

کون ہے جو آج یا آئندہ آنے والے زمانے میں کسی شخص کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر شفاعت کا دعویٰ کر سکے؟

جامد اور مستقل خاموشی کی صورت میں آنے والا نفی میں یہ جواب ہم سے صرف ایک سوال کرتا ہے۔

پیرِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ کر ہم دنیا میں اور کس وجود کو کھوجنے نکل کھڑے ہوئے ہیں؟ پیرِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیعت شدہ ہوتے ہوئے' ہمیں دوسرے کس شخص کی بیعت کی ضرورت رہ گئی ہے؟

پیرِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے پر چلنے کے بجائے ہمیں دوسرا کون سا راستہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے؟

کیا مسلمانوں کے لئے ایک اللہ' ایک قرآن' ایک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی سنت کافی نہیں؟

اللہ اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی کتاب کے علاوہ اور کون سا شخص' کون سا کلام ہے جو ہمیں دنیا اور آخرت کی تکلیفوں سے بچا سکے گا؟

جو ہماری دعاؤں کو قبولیت بخشے' جو ہم پر نعمتیں اور رحمتیں نازل کر سکے؟

کوئی پیرِ کامل کا فرقہ بتا سکتا ہے؟ نہیں بتا سکتا۔"

ڈاکٹر سبطِ علی کہہ رہے تھے۔

"وہ صرف مسلمان تھے' وہ مسلمان جو یہ یقین رکھتے تھے کہ اگر وہ صراطِ مستقیم پر چلیں گے تو وہ جنت میں جائیں گے' اس راستے سے ہٹیں گے تو اللہ کے عذاب کا نشانہ بنیں گے۔

اور صراطِ مستقیم وہ راستہ ہے جو اللہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے قرآن پاک میں بتاتا ہے۔ صاف' دوٹوک اور واضح الفاظ میں۔ وہ کام کریں جس کا حکم اللہ اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے دیتا ہے اور اس کام سے رک جائیں جس سے منع کیا جاتا ہے۔

اللہ' حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کسی بات میں کوئی ابہام نہیں رکھتے۔

قرآن کو کھولئے' اگر اس میں کہیں دوٹوک اور غیر مبہم الفاظ میں کسی دوسرے پیرِ کامل یا پیغمبر کا ذکر ملے تو اس کی تلاش کرتے رہئے اور اگر ایسا کچھ نظر نہیں آتا تو پھر صرف خوف کھایئے کہ آپ اپنے پیروں کو کس دلدل میں لئے جا رہے ہیں۔ اپنی پچاس ساٹھ سالہ زندگی کو کس طرح اپنی ابدی زندگی کی تباہی کے لئے استعمال کر رہے ہیں کس طرح خسارے کا سودا کر رہے ہیں۔ ہدایت کی تلاش ہے' قرآن کھولئے۔ کیا ہے جو وہ آپ کو نہیں بتا دیتا۔ وہ آپ کو معصوم' انجان اور بے خبر نہیں رہنے دیتا۔ آپ کا اصل آپ کا منہ پر دے مارتا ہے۔ کیا اللہ انسان کو نہیں جانتا ہوگا؟ اس مخلوق کو' جو اس کی اربوں کھربوں تخلیقات میں سے ایک ہے۔

دعا قبول نہیں ہوتی تو آسرے اور وسیلے تلاش کرنے کے بجائے صرف ہاتھ اُٹھا لیجئے' اللہ سے خود مانگیں۔ دے دے تو شکر کریں' نہ دے تو صبر...... مگر ہاتھ آپ خود ہی اُٹھائیں۔

زندگی کا قرینہ اور سلیقہ نہیں آ رہا تو اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف چلے جائیں' سب کچھ مل جائے گا آپ کو۔

احترام ہر ایک کا کریں۔ ہر ولی کا' ہر مومن کا' ہر بزرگ کا' ہر شہید کا' ہر صالح کا' ہر پارسا کا......

مگر اپنی زندگیوں میں ہدایت اور رہنمائی صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لیں کیونکہ انہوں نے آپ تک اپنے ذاتی احکامات نہیں پہنچائے جو کچھ بتایا ہے وہ اللہ کا نازل کردہ ہے۔

ڈاکٹر سید سبط علی کون ہے' کیا ہے' کون جانتا ہے اسے؟ آپ ......؟ آپ کے علاوہ چند سو لوگ ...... چند ہزار لوگ مگر جس پیرِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کر رہا ہوں انہیں تو ایک ارب کے قریب لوگ اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں۔ میں تو وہی کچھ کہتا' دہراتا پھر رہا ہوں' جو چودہ سو سال پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما چکے ہیں۔ کیا نئی بات کہی میں نے؟''

ڈاکٹر سبطِ علی خاموش ہو گئے تھے۔ کمرے میں موجود ہر شخص پہلے ہی خاموش تھا۔ انہوں نے وہاں بیٹھے ہر شخص کو جیسے آئینہ دکھا دیا تھا اور آئینے میں نظر آنے والا عکس کسی کو ہولا رہا تھا' کسی کو لرزا رہا تھا۔

وہاں سے باہر آ کر سالار بہت دیر تک اپنی گاڑی کی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں پر بندھی آخری پٹی بھی آج کھول دی گئی تھی۔

کئی سال پہلے جب امامہ ہاشم سوچے سمجھے بغیر گھر سے نکل پڑی تھی تو وہ اس لگن کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ اس کے نزدیک وہ حماقت تھی۔ بعد میں اس نے اپنے خیالات میں ترمیم کر لی تھی۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ کوئی بھی واقعی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں اس حد تک گرفتار ہو سکتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ دے۔

اس نے اسلام کے بارے میں جاننا شروع کیا تو اسے پتا چلا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی اسی طرح کی قربانیاں دیا کرتے تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک ان گنت لوگ تھے اور ہر زمانے میں تھے اور سالار سکندر نے اقرار کر لیا تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں اتنی طاقت تھی کہ وہ کسی کو بھی کچھ بھی چھوڑنے پر مجبور کر دیتی۔ اس نے کبھی اس محبت کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ آج وہاں بیٹھا پہلی بار یہ کام کر رہا تھا۔

یہ صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت نہیں تھی' جس نے امامہ ہاشم کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ صراطِ مستقیم کو دیکھ کر اس طرف چلی گئی تھی۔ اس صراطِ مستقیم کی طرف جسے وہ کسی زمانے میں اندھوں کی طرح ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ وہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسی صراطِ مستقیم کی طرف جاتے تھے۔

امامہ ہاشم نے کئی سال پہلے پیرِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پا لیا تھا۔ وہ بے خوفی اسی ہدایت اور رہنمائی کی عطا کردہ تھی جو اسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے ملی تھی۔ وہ آج تک پیرِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خود شناخت نہیں کر پایا تھا اور امامہ ہاشم نے ہر کام خود کیا تھا۔ شناخت سے اطاعت تک ...... اس کو سالار سکندر کی طرح دوسروں کے کندھوں کی ضرورت نہیں پڑی۔

سالار سکندر نے پچھلے آٹھ سالوں میں امامہ ہاشم کے لئے ہر جذبہ محسوس کیا تھا۔ حقارت' تضحیک' پچھتاوا' نفرت' محبت' سب کچھ ...... مگر آج وہاں بیٹھے پہلی بار اسے امامہ ہاشم سے حسد ہو رہا تھا۔ تھی کیا وہ ......؟ ایک عورت ...... ذرا سی عورت ......۔ آسمان کی حور نہیں تھی ...... سالار سکندر جیسے آدمی کے سامنے کیا اوقات تھی اس کی۔

کیا میرے جیسا آئی کیو تھا اس کا؟
کیا میرے جیسی کامیابیاں تھیں اس کی؟
کیا میرے جیسا کام کر سکتی تھی وہ؟
کیا میرے جیسا نام کما سکتی تھی؟

کچھ بھی نہیں تھی وہ اور اس کو سب کچھ پلیٹ میں رکھ کر دے دیا اور میں ...... میں جس کا آئی کیو لیول 150+ ہے مجھے سامنے کی چیزیں دیکھنے کے قابل نہیں رکھا؟

وہ اب آنکھوں میں نمی لئے اندھیرے میں ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

''مجھے بس اس قابل کر دیا کہ میں باہر نکلوں اور دنیا فتح کر لوں۔ وہ دنیا جس کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے اور وہ ...... وہ ......''

وہ رُک گیا۔ اسے امامہ پر غصہ آ رہا تھا۔ آٹھ سال پہلے کا وقت ہوتا تو وہ اسے ''بچ'' کہتا' تب امامہ پر غصہ آنے پر وہ اسے یہی کہا کرتا تھا مگر آٹھ سال کے بعد آج وہ زبان پر اس کے لئے گالی نہیں لا سکتا تھا۔ وہ امامہ ہاشم کے لئے کوئی برا لفظ نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ صراطِ مستقیم پر خود سے بہت آگے کھڑی اس عورت کے لئے کون زبان سے بُرا لفظ نکال سکتا تھا؟

اپنے گلاسز اُتار کر اس نے اپنی آنکھیں مسلیں۔ اس کے انداز میں شکست خوردگی تھی۔

''پیرِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ...... صراطِ مستقیم۔'' آٹھ سال لگے تھے' مگر تلاش ختم ہو گئی تھی۔ جواب مل چکا تھا۔

امربیل

سین 10

عباس نے اندر داخل ہوتے ہی لاؤنج کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"تو علیزہ بی بی! کرنا کیا چاہتی ہیں آپ؟"

عباس نے اس کے بالمقابل صوفہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے سر اٹھا کر اسے اور عمر کو دیکھا۔ سرد مہری اور سنجیدگی کے علاوہ ان دونوں کے چہرے پر اور کچھ بھی نہیں تھا۔

فون پر عباس سے بات کرنا اور بات تھی۔ آمنے سامنے اس سے کچھ کہنا دوسری بات ......اور وہ بھی ان حالات میں جس میں وہ گرفتار تھی۔ وہ عمر نہیں تھا جس پر وہ جھلا لیتی۔ اس کی بات کے جواب میں کچھ بھی کہنے کے بجائے اس نے سر جھکا لیا۔ وہ جانتی تھی اب نانو سب کچھ جان جائیں گی۔ پچھلے دن عمر کے ساتھ ہونے والی اس کی گفتگو اور اس کے بعد جسٹس نیاز کے سامنے کیا جانے والا انکشاف۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟" اس کی آواز میں اب کچھ تیزی تھی۔

"میں...... میں کیا کرنا چاہتی ہوں؟" اس نے بمشکل کہا۔

"کل فون پر کچھ کہہ رہی تھیں تم مجھ سے؟" علیزہ نے نانو کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کو دیکھ رہی تھیں۔ علیزہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ عباس کی بات کے جواب میں کیا کہے۔ اس کا غصہ اور اشتعال یک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

"اب خاموش کیوں ہو تم؟" عباس نے ایک بار پھر تلخی سے کہا۔

"آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں مجھ سے؟" اس نے سر اٹھایا۔

"وہی سب کچھ جو تم فون پر مجھ سے کہہ رہی تھیں۔" عباس نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ میں نے آپ سے فون پر کہا۔ مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔" اس نے عباس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"اور جو کچھ تم نے جسٹس نیاز سے کہا......؟"

"مجھے اس پر بھی کوئی شرمندگی نہیں ہے۔"

"جسٹس نیاز...... کیا علیزہ نے جسٹس نیاز سے کچھ کہا ہے؟" نانو بے اختیار چونکیں۔

"کچھ؟...... سب کچھ گرینی! یہ انہیں فون پر سب کچھ بتا چکی ہے۔ کس طرح میں نے اور عمر نے ان کے بیٹے اور اس کے دوستوں کو مارا...... کیوں مارا؟ سب کچھ۔"

"علیزہ؟" نانو کو جیسے عباس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

عباس یک دم ہونٹ بھینچے ہوئے اپنے صوفہ سے اٹھا اور اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ علیزہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اس کی جگہ سے اٹھا دیا۔ علیزہ عباس کی اس حرکت کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ اسی طرح اسے بازو سے کھینچتے ہوئے لاؤنج کے دروازے کی طرف جانے لگا۔

"عباس! اسے کہاں لے کر جا رہے ہو؟" نانو نے مداخلت کرنے کی کوشش کی۔

"کہیں نہیں گرینی! ابھی واپس لے آتا ہوں۔ آپ اطمینان سے بیٹھیں۔"

اس نے علیزہ کی مزاحمت کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ جواب اس سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اسی طرح اسے کھینچتے ہوئے باہر لے آیا۔

"عباس بھائی! میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔ آپ کہاں لے کر جانا چاہتے ہیں مجھے؟" عباس نے یک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"کہیں نہیں لے کر جانا چاہتا تمہیں۔ میں تمہیں صرف باہر کی دیوار اور وہ گولیاں دکھانا چاہتا ہوں جو چند گھنٹوں میں یہاں برسائی گئی ہیں۔ تمہیں دیکھنا چاہیے' تمہاری حماقت کی وجہ سے کیا ہوا ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں دیکھنا۔" علیزہ نے واپس اندر جانے کی کوشش کی۔

عباس نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچتے ہوئے گیٹ کی طرف لے جانے لگا۔

"کیوں نہیں دیکھنا جو چیز تمہاری وجہ سے ہوئی ہے۔ اسے دیکھنا چاہیے تمہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

علیزہ نے مزاحمت ختم کر دی۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

گیٹ کی طرف جاتے ہوئے اس نے بہت دور سے گیٹ پر بے شمار چھوٹے چھوٹے سوراخ دیکھ لیے تھے۔ وہ سوراخ کس چیز کے تھے' اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور اس کے باہر پولیس کی دو گاڑیاں موجود تھیں۔ گیٹ پر موجود پولیس والے عباس کو آتا دیکھ کر مستعد ہو گئے تھے۔ علیزہ کی شرمندگی میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہو گیا۔ عباس اب خاموش تھا مگر وہ اب بھی اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔

گیٹ کے باہر جاتے ہوئے اس نے انگلش میں علیزہ سے کہا۔

"دروازے بند کر کے گھر کے اندر بیٹھے ہوئے باتیں کرنا' بہت آسان ہوتا ہے۔ تمہاری طرح ہر ایک کے لئے" اس نے عباس کی بات کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ صرف خاموشی سے باؤنڈری وال کو دیکھتی رہی رات کو فلڈ لائٹس کی روشنی میں وہ دیوار اور گیٹ جتنا خوفناک لگ رہا تھا۔ دن کے وقت اس سے زیادہ لگتا۔

"تمہیں صرف ایک گولی کافی تھی۔" وہ مدھم آواز میں انگلش میں بولا۔ شاید وہ اردگرد موجود دوسرے لوگوں کی وجہ سے احتیاط کر رہا تھا۔ علیزہ کچھ بول نہیں سکی۔ وہ اب اس کا ہاتھ چھوڑ چکا تھا۔

"اندر آؤ۔" وہ درشتی سے اس سے کہتے ہوئے واپس گیٹ کی طرف مڑ گیا۔

علیزہ نے اسی خاموشی کے ساتھ سر جھکائے ہوئے اس کی پیروی کی۔ اس نے گیٹ کے اندر آ کر اس سے کچھ نہیں کہا۔ تیز قدموں کے ساتھ وہ اندر جا رہا تھا۔ علیزہ سر جھکائے اس کے پیچھے چلتی رہی۔

آگے پیچھے چلتے ہوئے جب وہ لاؤنج میں پہنچے تو نانو اور عمر ابھی بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ نانو کے چہرے پر تشویش تھی جبکہ عمر کے ہاتھ میں اس وقت پائن ایپل کا ایک ٹن تھا اور وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہوئے بڑے اطمینان سے کانٹے کے ساتھ پائن ایپل کے سلائس کھانے میں مصروف تھا۔ ان دونوں کو اندر آتے دیکھ کر اس نے ایک لمحے کے لئے نظر اٹھائی اور ایک بار پھر پائن ایپل کھانے میں مصروف ہو گیا۔

علیزہ خاموشی کے ساتھ صوفہ پر جا کر بیٹھ گئی۔

"اب اس کے بعد اور کیا ہے آپ کے ذہن میں؟" عباس نے اس بار علیزہ کا نام نہیں لیا تھا مگر علیزہ جانتی تھی' یہ سوال اسی سے ہی کیا گیا ہے۔

"مجھے اب بھی کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ یہ سب میری وجہ سے نہیں ہو رہا۔"

عمر پائن ایپل کھاتے کھاتے رک گیا۔ عباس اور اس نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اگر عمر گارڈ نہ ہٹاتا تو وہ لوگ یہاں کبھی حملہ نہ کرتے۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"کون لوگ؟" عباس نے تلخ اور تیز آواز میں اس سے کہا۔

"جو لوگ بھی یہاں آئے ہیں۔"

"کون لوگ آئے ہیں؟"

"مجھے نہیں پتا۔"

"کیوں نہیں پتا؟"

"مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے؟"

"تمہارے علاوہ اور کس کو پتا ہو سکتا ہے۔"

"آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے کہ یہاں کون آیا ہے۔"

"تم فون کر کے لوگوں کو یہاں بلواتی ہو اور پھر یہ کہتی ہو کہ تمہیں پتا نہیں ہے۔"

وہ عباس کا منہ دیکھنے لگی "میں لوگوں کو فون کر کے بلواتی ہوں؟"

"ہاں تم۔"

"میں نے کسی کو فون کر کے یہاں نہیں بلوایا۔"

"تم نے جسٹس نیاز کو فون کیا تھا۔"

اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "آپ ...... آپ کا مطلب ہے کہ ان ...... ان لوگوں کو جسٹس نیاز نے بھجوایا تھا؟"

"اور کون ہو سکتا ہے۔"

وہ الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ "یہ ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جسٹس نیاز یہ کیسے کر سکتے ہیں؟"

"تم کس دنیا میں رہتی ہو۔ اپنی آنکھوں پر کون سے بلائنڈز لگا کر پھر رہی ہو۔"

وہ ماؤف ہوتے ہوئے ذہن کے ساتھ عباس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"جسٹس نیاز ...... جسٹس نیاز مجھے ...... مجھے اغوا کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ ...... وہ یہ سب کریں گے ...... کیوں ...... یا اللہ۔" اس کا ذہن سوالوں کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔

"مجھے یقین نہیں ہے کہ جسٹس نیاز نے یہ سب کیا ہے۔"

عباس بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "فون پڑا ہوا ہے تمہارے سامنے ...... نمبر تم جانتی ہو' فون ملاؤ اور ان سے بات کر لو ...... اپنی خیریت کی اطلاع دو انہیں اور ساتھ یہ بھی بتا دو کہ ابھی تک تم یہیں ہو۔ وہ دوبارہ کسی کو بھیجیں۔"

علیزہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔

"تم عقل سے پیدل ہو۔"

"آپ مجھے اس لیے یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں کیونکہ آپ خوفزدہ ہیں ...... یہ سب کچھ آپ دونوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ لوگوں ان چاروں کو قتل نہ کرتے تو آج یہ سب کچھ نہ ہو رہا ہوتا۔" اس نے سر اٹھا کر عباس سے کہا۔

"ایکسکیوز می میڈم ......! کون خوفزدہ ہے اور کس سے ...... تم سے؟ ...... جسٹس نیاز سے ...... مائی فٹ۔" عباس اس بار بری طرح ہتھے سے اکھڑا تھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو کہ میں بہت خوفزدہ ہوں کل سے۔" وہ اس کے بالکل سامنے کھڑا ہوا

کہہ رہا تھا۔ ''مجھے اپنا کیریئر تاریک نظر آ رہا ہے؟''

علیزہ نے سر جھکا لیا۔

''اپنی گردن میں پھانسی کا پھندہ نظر آ رہا ہے؟''

وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔

''تمہارے اس انکشاف کی وجہ سے میں نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے؟'' عباس کی آواز بہت بلند تھی۔ ''جسٹس نیاز کے ساتھ ہونے والی گفتگو نے میری نیند اور سکون حرام کر دیا ہے؟''

اس نے عباس کو کبھی اتنے اشتعال میں نہیں دیکھا تھا۔ انکل ایاز کی طرح وہ بھی ایک نرم خو شخص تھا مگر اس وقت وہ جس طرح بول رہا تھا۔

''تمہارا خیال ہے کہ کل میں سلاخوں کے پیچھے ہوں گا؟''

علیزہ نے سر جھکائے ہوئے کن اکھیوں سے عمر کو دیکھا۔ وہ عباس یا علیزہ کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے کانٹے اور پائن ایپل کے ڈبے کے ساتھ مصروف تھا...... ہر چیز سے بے پروا...... ہر چیز سے بے نیاز...... یوں جیسے وہاں بہت دوستانہ گفتگو ہو رہی تھی۔

''تم کون ہو علیزہ سکندر...... اور جسٹس نیاز کون ہے۔''

علیزہ ایک بار پھر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی جو اب لرز رہے تھے، وہ اس لرزش کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''جس خاندان سے تم اور میں تعلق رکھتے ہیں، اس خاندان کے کسی شخص کو کورٹ میں لے جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سورج کا مغرب سے نکلنا۔ تم نے کل فون پر مجھ سے جو بھی کچھ کہا۔ میں اس سب پر لعنت بھیجتا ہوں۔

تم میرے خلاف پرائم witness (عینی گواہ) بننا چاہتی ہو ضرور بنو، لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔''

اس نے سر اٹھا کر عباس کو دیکھا۔

''وہ جو چار لڑکے میں نے مارے ہیں نا، وہ چاروں اگر خود بھی زندہ ہو جائیں اور کورٹ میں جا کر میرے خلاف بیان دیں تو بھی...... مجھے سزا دلوانا تو دور کی بات، لاہور سے میرا ٹرانسفر تک کوئی نہیں کروا سکتا۔''

اس کی آواز اور انداز میں کھلا چیلنج تھا۔

''میں یہیں تھا۔ یہیں ہوں، یہیں رہوں گا۔''

اس کی آواز اب پہلے سے ہلکی اور پہلے سے زیادہ سرد تھی۔

''اگر جسٹس نیاز یا تم جیسے لوگوں کے کہنے پر پولیس کو سزائیں ملنے لگیں تو پورے ملک کی

پولیس تمہیں سلاخوں کے پیچھے نظر آئے گی۔''

علیزہ نے سر جھکا لیا۔

''تم نے کل خاصی لمبی چوڑی بات کی تھی مجھ سے...... لیکن مجھے کوئی فرق نہیں پڑا اس سے۔

یہ سب کچھ میری نیندیں نہیں اڑا سکتا۔ میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکالنے کے لیے تمہیں اس سے دس گنا بڑا اسسٹنٹ چاہیے۔'' وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ صرف بڑکیں نہیں تھیں۔ یہ وہ جانتی تھی عباس حیدر کو بڑکوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

''عباس بھائی! مجھے آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے...... میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ ایک غلط کام......''

عباس نے درشتی سے اس کی بات کاٹ دی۔

''مائنڈ یور اون بزنس۔ میرے پروفیشن کی اخلاقیات سکھانے کی کوشش مت کرو۔ میں اپنے پروفیشن کو تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔ کیا صحیح ہے کیا غلط، اس کی تعریف مجھے تم سے نہیں چاہیے۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ ''And don`t try to poke your nose into my affairs'' (تمہیں میرے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں)

وہ اس کی کوئی بات سننے پر تیار نہیں تھا۔

''دو ماہ کسی تھرڈ کلاس میگزین کے دفتر میں کام کرنے سے تم اس قابل نہیں ہو گئی ہو کہ دوسروں کو صحیح اور غلط کا فرق بتاتی پھرو۔'' علیزہ نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ''تمہارے جیسے Self-employed reformers (بزعم خود مصلح) کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں اور نہ ہی تمہیں ہیومن رائٹس کی چیمپئن بننے کی ضرورت ہے۔''

نانو نے اب تک ہونے والی گفتگو میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ وہ اگر مداخلت کرتیں بھی تو عباس انہیں بولنے کا موقع نہ دیتا۔ علیزہ کو اس کا اندازہ تھا۔

''چند منٹ اور اگر پولیس کو آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ لوگ بیسمنٹ تک بھی پہنچ جاتے۔ اس کے بعد وہ کیا کرتے، تمہیں اس کا اندازہ ہے۔ مائی ٹیلنٹڈ کزن......'' اس کے لہجے میں اب طنز تھا۔ ''تمہیں یہیں مار دیتے وہ یا پھر لے جاتے ساتھ...... کہاں...... یہ پھر کسی کو پتا نہ چلتا۔''

علیزہ کے ہونٹ لرزنے لگے۔ ''اپنے آپ کو کس طرح پھنسا لیا ہے تم نے...... تمہیں اندازہ ہے؟'' علیزہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''تمہیں ان سب چیزوں سے بچانے کے لیے ان چاروں کو مارا تھا۔ لیکن تم نے خود ساری مصیبتوں کو دعوت دے دی ہے...... اپنے ساتھ تم نے گرینی کی زندگی کو بھی خطرے میں ڈال

دیا ہے۔" وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"اب کیا کرو گی تم ...... بیٹھی رہو گی یہاں اندر ...... اسی تہہ خانے میں ...... کتنے دن رکھیں گے پولیس گارڈ باہر ...... اور کہاں کہاں پروٹیکشن دیں گے تمہیں ...... بڑا شوق ہے نا تمہیں ہیروئن بننے کا ...... لائم لائٹ میں آنے کا ...... اب آنا ......"

علیزہ کی قوت مدافعت مکمل طور پر جواب دے رہی تھی' اس کے آنسو اس کے ہاتھوں پر گرنے لگے۔ اس نے اس بار انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ "کس قدر غیر محفوظ کر لیا ہے تم نے اپنے آپ کو ...... تمہیں اندازہ ہے؟" اس کے آنسوؤں نے عباس پر کوئی اثر نہیں کیا۔

"جسٹس نیاز یا باقی تینوں کے گھر والے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے مگر تمہیں وہ نہیں چھوڑیں گے۔ آخر مارے تو وہ تمہاری وجہ سے ہی گئے تھے۔" اس کی آواز میں اب تلخی کے ساتھ بے رحمی بھی تھی۔

علیزہ نے اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔

"اپنے فیوچر کے بارے میں سوچا ہے' کیا ہو گا آگے؟"

اس کی آواز اب پہلے سے زیادہ مدھم تھی مگر آواز میں موجود تلخی کم نہیں ہوئی۔

"اخباروں میں تمہارا نام آئے گا ...... اور کس طرح آئے گا؟ ...... لوگ سیلوٹ کریں گے تمہیں؟ ...... یا تمہارے ہیروازم کو ...... یا پھر انگلیاں اٹھائیں گے تمہارے کریکٹر پر؟" وہ اب بھی اسی طرح بول رہا تھا۔ "اور کون کھڑا ہو گا ...... تمہارے پیچھے ...... جسٹس نیاز ...... کب تک؟ ...... ٹشو پیپر کی طرح استعمال کریں گے وہ تمہیں ...... اس کے بعد ...... کیا کرو گی تم ......؟"

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اٹھ کر وہاں سے بھاگ جائے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ عباس کی تمام باتیں سننے پر مجبور تھی۔

"اور فیملی کے لوگ کیا کہیں گے؟ اس کے بارے میں سوچا ہے۔ جو بھی کیا گیا تمہارے لیے کیا گیا اور اگر تم دوسروں کو ڈبونے کی کوشش کرو گی تو تمہیں ڈبوتے ہوئے بھی کوئی تم سے اپنا رشتہ سوچے گا ...... نہ لحاظ کرے گا ...... اور جب تمہاری اپنی فیملی تمہارے خلاف ہو جائے گی تو تم کیا کرو گی؟" وہ تیکھے لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا اتنی بہادر ہو تم کہ اکیلے دنیا کا مقابلہ کر سکو ...... اور ایک دو دن کے لیے نہیں ...... ساری زندگی کے لیے۔"

وہ بے آواز رو رہی تھی۔

"جس معاشرے میں تم رہ رہی ہو ...... اس کی Norms (اطوار) جانتی ہو ...... خاندان کی Discarded (ٹھکرائی ہوئی) عورت کا مقام جانتی ہو تم ...... تم کسی پہاڑ کی چوٹی پر

ساری عمر کے لیے چلہ کاٹنے بھی بیٹھ جاؤ تو بھی تمہاری پاک بازی پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔"

عباس کی باتوں میں وہی تلخی تھی جو عمر کی باتوں میں ہوا کرتی تھی۔ عمر کے لہجے میں اس کے لیے سردمہری کے باوجود کبھی کبھار اپنائیت جھلکنے لگتی تھی ...... عباس کے لہجے میں ایسی کوئی اپنائیت نہیں تھی۔ وہ بہت ٹھوس لہجے میں بول رہا تھا۔

"اور تمہیں اگر کہیں یہ شائبہ ہے کہ میں کبھی اپنی اس حرکت پر پچھتاوا محسوس کروں گا یا مجھے اپنے فیصلے پر کوئی شرمندگی ہو گی ...... تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔"

وہ مسلسل بول رہا تھا۔

"اگر دوبارہ وقت پیچھے چلا جائے تو میں ایک بار پھر وہی کروں گا جو میں نے کیا ...... میں ان چاروں کو پھر شوٹ کروا دوں گا ...... اور دس بار موقع ملنے پر بھی میں یہی کروں گا۔"

اس کا لہجہ اب بھی اتنا ہی تلخ تھا۔ "یہ کوئی بے سوچا سمجھا فیصلہ نہیں تھا ...... طے شدہ تھا ...... میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا اور مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔" وہ اب اپنے صوفہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

"صحیح یا غلط یہ میرا فیصلہ تھا اور ...... میں اس پر قائم ہوں ...... تو تمہیں اس کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے ...... ہر چیز کا ذمہ دار میں ہوں ...... نتائج جو بھی ہوں۔ اس کا سامنا میں ہی کروں گا پھر تم خود کو انوالو کیوں کر رہی ہو۔" وہ چند لمحوں کے لیے بولتے بولتے رکا۔

"میں نے ابھی تک پاپا کو تمہاری کل کی حرکت کے بارے میں نہیں بتایا ...... اب بتاؤں گا ...... باقی باتیں تم خود ان سے کر لینا۔" اس کی آواز کا اشتعال اب بہت کم ہو گیا تھا۔

"گرینی! آپ اپنی پیکنگ کر لیں۔ آپ ابھی میرے گھر شفٹ ہو رہی ہیں کیونکہ میں آپ کو یہاں نہیں چھوڑ سکتا ...... کم از کم تب تک جب تک سب کچھ ٹھیک نہیں ہو جاتا۔" وہ اب نانو سے مخاطب تھا۔

"اور علیزہ جہاں تک تمہارا تعلق ہے۔ تم اپنی سیکورٹی کی خود ذمہ دار ہو ...... بہتر ہے تم خود جسٹس نیاز کے پاس چلی جاؤ۔ اس طرح کم از کم تمہاری زندگی محفوظ رہے گی ...... اور اگر تم یہاں ہی رہنا چاہتی ہو تو رہ سکتی ہو لیکن تمہارے لیے میں اب یہاں کوئی پولیس پروٹیکشن نہیں دے سکتا۔"

وہ بات کرتے کرتے اٹھ گیا۔

"آیئے گرینی! آپ کے ساتھ آپ کی پیکنگ کرواؤں۔"

علیزہ اسی طرح سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔ چند منٹوں کے بعد اس نے نانو' عمر اور عباس کو لاؤنج سے نکلتے محسوس کیا۔

علیزہ نے اپنی آنکھوں سے ہاتھ ہٹا لیے اور سر اوپر اٹھایا۔ چند لمحوں کے لیے وہ ساکت ہو گئی۔ عمر وہیں تھا...... سامنے صوفہ پر بیٹھے ہوئے ...... اس پر نظریں جمائے ...... اب اس کے ہاتھ میں پائن ایپل کاش نہیں تھا۔ علیزہ نے ایک بار پھر سر جھکا لیا۔

عمر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ سینٹر ٹیبل کو کھینچ کر وہ اس کے بالمقابل لے آیا اور ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے اس نے علیزہ کی آنکھوں سے اس کے ہاتھ ہٹا دیئے۔ علیزہ نے برہمی سے اس کے ہاتھ پیچھے کرنے کی کوشش کی۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے عمر۔"

"میری وجہ سے؟"

"تم نے پولیس گارڈ ہٹائی تھی۔"

"وہ تمہاری خواہش تھی۔"

"تمہاری وجہ سے عباس نے میری انسلٹ کی ہے۔"

"اس نے تمہاری انسلٹ نہیں کی ...... تمہیں حقائق بتائے ہیں۔"

وہ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے رونے لگی۔

"تم نے سوچا ہے' ابھی کچھ دیر کے بعد جب ہم سب یہاں سے چلے جائیں گے تو کیا ہو گا؟ ...... یہاں اکیلے رہ سکو گی ...... اور پھر جو کچھ تم کرنا چاہتی ہو ...... کیا اس کے نتائج پر غور کیا ہے تم نے' تم منظر سے ہٹ کیوں نہیں جاتیں؟"

"Why are you making a mess of your life?" (تم اپنی زندگی کو تماشا کیوں بنا رہی ہو) وہ ایک لحہ کے لیے رکا۔ "Why don`t you get out of everything?"

علیزہ نے سر اٹھا کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "کیا یہ ممکن ہے؟ ...... اب؟"

"کیوں نہیں؟"

"کیسے؟"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو۔"

"لیکن کیسے؟"

"اپنا سامان پیک کرو اور عباس کے ساتھ چلی جاؤ ...... صبح وہ تمہیں اسلام آباد انکل ایاز کے پاس بھجوا دے گا۔ چند ماہ وہاں رہو ...... جب سب کچھ سیٹل ہو جائے تو واپس آ جانا ...... It`s simple as that" (سیدھی سی بات ہے) اس نے جیسے چٹکی بجاتے میں حل پیش کیا۔

"کیا عباس مجھے لے کر جائے گا؟"

"ہاں کیوں نہیں ...... وہ نہیں تو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم اب بھی ہمارا حصّہ ہو۔" اس نے جیسے علیزہ کو یقین دلایا۔

"مگر میں جو کچھ جسٹس نیاز کو بتا چکی ہوں ...... سب کچھ کل پریس میں آ سکتا ہے ...... اور پھر ......"

"اس کو ہم ہینڈل کر لیں گے ...... وہ اب تمہارا دردِ سر نہیں ہے ...... تم بس خاموشی سے اسلام آباد میں رہنا۔" وہ پلکیں جھپکائے بغیر عمر کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"میں تم پر کوئی دباؤ نہیں ڈال رہا ہوں ...... تم فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہو۔ لیکن میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں ...... میں نہیں چاہتا کہ تمہاری زندگی برباد ہو جائے ......" وہ محتاط اور سنجیدہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"تمہیں کسی چیز کے لیے بھی گلٹی فیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے ...... اگر تمہارے نزدیک کوئی غلط کام ہوا ہے تو اس کے ذمہ دار میں اور عباس ہیں ...... پھر تم اپنی زندگی کیوں خراب کر رہی ہو۔" وہ چند لمحوں کے لیے رکا۔ "ابھی کسی کو کچھ بھی نہیں پتا ...... فیملی میں نانو' میرے اور عباس کے علاوہ اور کوئی بھی کچھ نہیں جانتا ...... اور ہم تینوں تمہاری اس حماقت کو بھلا سکتے ہیں ...... چند ماہ بعد تم اپنی زندگی دوبارہ یہیں سے شروع کر سکتی ہو۔"

"Stay out of everything" اس کے بہتے ہوئے آنسو رک گئے "Aleeza! Just stay out" (دور چلی جاؤ علیزہ! اس سب سے دور چلی جاؤ)

وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اور لفظوں کو سنتے ہوئے مکمل طور پر کنفیوژن کا شکار ہو چکی تھی۔ کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے تھکے ہوئے انداز میں سر جھکا لیا۔

"ٹھیک ہے۔"

عمر کے چہرے پر پہلی بار ایک پُرسکون مسکراہٹ ابھری۔

"تم جا کر اپنی چیزیں پیک کرو۔ میں عباس سے بات کرتا ہوں۔"

......❁......

شہرِ ذات

سین 11

صلوۃ التسبیح کی نماز پڑھنے کے بعد وہ مسجد سے باہر نکل رہی تھی۔ جب اچانک بغیر کسی وجہ کے اس کا دل بھر آیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل گھر جانے کو نہیں چاہا تھا۔ وہ سیڑھیوں کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی۔ عورتیں مسجد کے اس مخصوص دروازے سے نکل کر جا رہی تھیں وہ گھٹنوں میں سر چھپائے وہیں بیٹھی رہی۔

"تجھے کیا ہوا ہے؟" کس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی جو اس کے سامنے سیڑھی پر کھڑی تھی۔

"پتا نہیں اماں۔" اس نے کہا تھا۔

"کس کے ساتھ آئی ہے؟" اس عورت نے ادھر اُدھر دیکھ کر پوچھا تھا۔

"پتا نہیں۔"

"روتی کیوں ہے؟" اس عورت کی نظر اب اس کے چہرے پر تھی۔

"یہ بھی پتا نہیں۔"

"کوئی بیماری لگ گئی ہے؟" اس عورت کی آواز میں اب تشویش تھی۔

"بیماری نہیں اماں! روگ۔"

"ہائے ہائے! اس جوانی میں روگ لگ گیا۔" اب اس کی آواز میں ہمدردی تھی۔

"یہ روگ جوانی میں ہی لگتے ہیں اماں۔"

"گھر کیوں نہیں جاتی؟"

"گھر ہو تو جاؤں۔"

"گھر چاہیے؟"

"نہیں؟"

"تو پھر؟" وہ عورت اب حیران تھی۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس عورت کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"تمہیں کیا بتاؤں اماں کیا چاہیے؟"

"تو بتا تو سہی۔" عورت نے اصرار کیا۔

"بتانے سے مل جائے گا کیا؟"

"سب کچھ بتانے سے ہی ملتا ہے۔ نہ بتانے سے کیسے ملے گا۔ مانگنا پڑتا ہے۔ کہنا پڑتا ہے۔ مِنت کرنی پڑتی ہے' وجود کے نصیب میں ہے بھکاری ہونا بس ذات بھکاری نہیں ہو سکتی۔"

وہ سن ہو گئی تھی۔ ایک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سے گزر گئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر بوڑھی عورت کا چہرہ دیکھا تھا۔

"وجود کے مقدر میں مانگنا ہے۔ "ذات" کا وصف دینا ہے۔ کوئی عشق مانگتا ہے' کوئی دنیا اور جو یہ نہیں مانگتا وہ خواہش کا نہ ہونا مانگتا ہے۔"

اس نے بے اختیار اس بوڑھی عورت کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے پوری طاقت سے یوں جیسے وہ غائب ہو جائے گی۔

"تو بتا' تجھے کیا چاہیے؟" پچھلے ایک سال سے جو فقرے رات دن اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ وہ انہیں سننے میں غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ پورے دو سال بعد اس نے ایک بار پھر وہی کلمات اس عورت کے منہ سے سنے تھے جو دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے اس فقیر نے کہے تھے۔

"ہاں تو بتا' تجھے کیا چاہیے؟" عورت ایک بار پھر سے اس سے پوچھ رہی تھی۔ اس کا پورا وجود کسی پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

"مجھے کُل چاہیے۔ مجھے ذات چاہیے۔ مجھے اللہ چاہیے' صرف اللہ چاہیے۔"

وہ کسی ننھے بچے کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ کر بلکنے لگی تھی۔

"اس سے کہو۔ مجھے دیکھے اس سے کہو۔ مجھ پر نظر کرے' ایک بار ایک لمحہ کے لئے' میں دیکھنے کے قابل نہیں ہوں پر اس سے کہو مجھے دیکھے اسے کہو میرے گندے وجود پر بھی ایک بار اپنی نظر کرے۔ اسے تو ٹھوکر مارنا نہیں آتا۔ اسے تو دھتکارنا نہیں آتا۔ وہ تو فرق نہیں کرتا۔ وہ تو آس نہیں توڑتا۔"

اس نے اب عورت کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے آگے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

"تجھے بتایا ہے اس نے تو کیا تجھے چھوڑ دے گا؟ کبھی ماں میلے میں بچے کی انگلی چھوڑتی ہے اگر چھوٹ بھی جائے تو بچہ اتنا بے قرار نہیں ہوتا جتنی ماں ہوتی ہے۔ پھر اللہ انسان کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ تجھے کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ اس کی نظر میں جو ایک بار آ جاتا ہے ہمیشہ رہتا ہے۔"

اس نے اس عورت کے منہ سے ایک بار پھر وہی لفظ سنے تھے۔ اس نے سیڑھی سے ٹیک لگا لی۔ ایک عجیب سی ٹھنڈک اسے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ بہت گہرا سکون اس کے اندر اترتا

جا رہا تھا اس کے آنسو تھم گئے تھے۔

''گھر جا' اب اور کیا چاہیے تجھے؟''

اس عورت نے ایک بار پھر اس سے کہا تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''چلی جاؤں گی اماں! اب واقعی اور کیا چاہیے۔''

بڑبڑاتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دیں' سامنے سیڑھی پر کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ عورت غائب ہو چکی تھی۔ وہ پرسکون انداز میں وہیں بیٹھی رہی اس نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

15 اگست 2001

سین 12

میرے باپ نے اگلے دن صحن کے ایک کونے میں اس چھری کی دھار کو تیز کیا جس سے ہر سال بکرے ذبح کیے جاتے تھے۔ وہ کندھے پر پڑے ہوئے کپڑے کے ساتھ اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو صاف کرتا جاتا اور پتھر پر چھری کو رگڑتا جاتا۔ میں ایک دفعہ اسے چھری ہاتھ میں لیے دیکھ کر کمرے میں آ گیا اور پھر باہر نہیں گیا۔ چارپائی پر بیٹھے میں اپنی دونوں بڑی بہنوں کو کمرے میں آتے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

اس دن میں نے ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے چہروں سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ میں جانتا تھا زندگی میں دوبارہ کبھی میں ان چہروں کو نہیں دیکھ سکوں گا۔ وہ رات کو سو گئیں تو میرے باپ نے مجھے کمرے سے باہر جانے کے لیے کہا۔ میں کپکپاتے ہوئے باہر آ گیا' کچھ دیر بعد میرا باپ بھی باہر آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں چھری تھی مگر چھری پر خون نہیں تھا۔ میں خشک لبوں کے ساتھ اپنے باپ کو دیکھتا رہا۔ ''میں انہیں مار نہیں سکا...... میں اپنے ہاتھ سے انہیں مار نہیں سکتا۔ میں گھر کو جلا دیتا ہوں وہ اس کے ساتھ ہی جل جائیں گی''۔ میرے باپ نے کانپتی آواز میں کہا۔

اس نے ان کی چارپائیوں کے گرد مٹی کا تیل چھڑک دیا اور پھر آگ لگا کر دروازہ بند کر دیا۔ صحن میں کھڑے ہو کر میں نے اپنی بہنوں کی چیخیں سنی تھیں یا پھر شاید چتا جلتے دیکھی تھی۔ ہم لوگ تب تک وہاں کھڑے رہے جب تک آگ کے شعلے پوری طرح بھڑکنے نہیں لگے۔ پھر میں صحن میں بیٹھ کر بلند آواز میں رونے لگا۔ ان بہنوں نے مجھے اپنی گود میں کھلایا تھا' میں نے ان کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا۔ اب ان کی چیخیں...... ان کی چیخیں......!

''یہ جلدی مر جائیں' جلدی مر جائیں' جلدی مر جائیں۔'' میں زمین پر بیٹھا بلند آواز میں دعا کر رہا تھا...... پھر...... پھر...... آہستہ آہستہ آگ نے پورے کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا''۔ اور...... اور...... چیخیں دم توڑ گئیں۔

تب میرے باپ نے مجھے اور اس گٹھڑی کو لیا جو اس نے پہلے ہی تیار کر کے رکھی تھی اور

ہم راتوں رات وہ جگہ چھوڑ گئے۔ ہم دونوں ایک گھوڑے پر سوار تھے جسے میرا باپ دوڑا رہا تھا اور میں اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ فجر کے وقت ہم کسی گاؤں میں داخل ہوئے' جہاں اور بھی بہت سے لوگ تھے اور ان میں وہ چھ قاتل بھی تھے۔ ویسے ہی قاتل جیسا میرا باپ تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا...... وہی جو ہر قافلے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک لمبا سفر طے کر کے ہم جس دن پاکستان میں داخل ہوئے' وہ پندرہ اگست کا دن تھا اور لاہور کا بارڈر تھا اور تب میرے باپ نے زمین سے مٹی کی ایک مٹھی اٹھا کر اس رومال میں رکھی جو وہ ہر وقت کندھے پر لیے رہتا تھا اور جس سے اس نے میرے بھائی کے جسم سے گرد صاف کی تھی اور پھر اس کی ایک پوٹلی سی بنا کر اس نے اپنی جیب میں رکھ لی...... اور...... اور...... اس کے بعد میرا باپ دھاڑیں مار مار کر زمین سے سر ٹکرا ٹکرا کر روتا رہا۔

میں نے اسے بھائی' ماں اور شکیلہ باجی کے ساتھ ہونے والے حادثے پر بھی اس طرح روتے نہیں دیکھا تھا' تب وہ صرف آنسو بہاتا رہا تھا۔ مگر اس دن وہ بلند آواز میں چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ وہاں میرے علاوہ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا وہاں اس کے علاوہ بھی اور بہت سے رونے والے تھے۔ صرف میں تھا جو زمین پر بیٹھا گیلی آنکھ کے ساتھ باپ کی دیوانگی دیکھتا رہا۔ اب اتنے سالوں بعد میں سوچتا ہوں کہ وہ کیوں رویا تھا۔ کیا اسے اپنا خاندان یاد آیا تھا۔ زمینیں اور گھر بار یاد آ رہا تھا یا پھر......

میں نے اس کے بعد اپنے باپ کو کبھی روتے نہیں دیکھا...... بڑی سے بڑی مصیبت یا تکلیف پر بھی نہیں......

پیر کامل

سین 13

وہ آدھ گھنٹہ میں سعیدہ اماں کے ہاں پہنچ گئے تھے۔ دروازہ سعیدہ اماں نے ہی کھولا تھا اور سالار اور فرقان کو دیکھ کر وہ جیسے خوشی سے بے حال ہو گئی تھیں۔ وہ ان دونوں کو اسی بیٹھک نما کمرے میں لے گئیں۔

"سعیدہ اماں! سالار' آمنہ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔"

فرقان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ سعیدہ اماں کچھ الجھیں۔

"کیسی باتیں؟" وہ اب سالار کی طرف دیکھ رہی تھیں جو خود بھی بیٹھنے کے بجائے فرقان کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔

"ہیں چند باتیں' جو وہ اس سے کرنا چاہتا ہے مگر پریشانی والی کوئی بات نہیں۔" فرقان نے انہیں تسلی دی۔

سعیدہ اماں ایک بار پھر سالار کو دیکھنے لگیں۔ اس نے نظریں چرا لیں۔

"اچھا...... پھر تم میرے ساتھ آ جاؤ بیٹا! آمنہ اندر ہے۔ ادھر آ کر اس سے مل لو۔"

سعیدہ اماں کہتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئیں۔ سالار نے ایک نظر فرقان کو دیکھا پھر وہ خود بھی سعیدہ اماں کے پیچھے چلا گیا۔

بیٹھک بیرونی دروازے کے بائیں جانب تھی۔ دائیں جانب اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ بیرونی دروازے سے کچھ آگے بالکل سامنے کچھ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد لکڑی کا ایک اور پرانی طرز کا بہت بڑا دروازہ تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا اور وہاں سرخ اینٹوں کا بڑا وسیع صحن نظر آ رہا تھا۔

سعیدہ اماں کا رخ ان ہی سیڑھیوں کی طرف تھا۔ سالار ان سے کچھ فاصلے پر تھا۔ سعیدہ اماں اب سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ وہ جب سیڑھیاں چڑھ کر صحن میں داخل ہو گئیں تو سالار بھی کچھ جھجکتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

وسیع سرخ اینٹوں کے صحن کے اطراف دیواروں کے ساتھ کیاریاں بنائی گئی تھیں جن میں لگے ہوئے سبز پودے اور بیلیں سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی دیواروں کے بیک گراؤنڈ میں بہت

خوبصورت لگ رہی تھیں۔ صحن کے ایک حصّے میں دھوپ تھی اور دن کے اس حصّے میں بھی وہ دھوپ بے حد تیز تھی۔ دھوپ نے سرخ رنگ کو کچھ اور نمایاں کر دیا تھا۔

آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر سالار نے صحن میں قدم رکھ دیا اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ صحن کے دھوپ والے حصّے میں رکھی چارپائی کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہ شاید ابھی چارپائی سے اُتری تھی۔ اس کی پشت سالار کی طرف تھی۔ وہ سفید کرتے اور سیاہ شلوار میں ملبوس تھی اور نہا کر نکلی تھی۔ اس کی کمر سے کچھ اوپر اس کے سیاہ گیلے بال لٹوں کی صورت میں اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا سفید دوپٹہ چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے کرتے کی آستینوں کو کہنیوں تک فولڈ کرتے ہوئے سالار کی طرف مڑی تھی۔

سالار سانس نہیں لے سکا۔ اس نے زندگی میں اس سے زیادہ خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی یا پھر اسے اس لڑکی سے زیادہ خوب صورت کوئی نہیں لگا تھا۔ وہ یقیناً آمنہ تھی۔ اس گھر میں آمنہ کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ وہ اس سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ کسی نے اس کے دل کو مٹھی میں لیا تھا۔ دھڑکن رکی تھی یا رواں وہ جان نہیں سکا۔

اس کے اور آمنہ کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔ آستین موڑتے ہوئے آمنہ کی پہلی نظر سعیدہ اماں پر پڑی۔

"سالار بیٹا آیا ہے۔"

سعیدہ اماں بہت آگے بڑھ آئی تھیں۔ آمنہ نے گردن کو ترچھا کرتے ہوئے صحن کے دروازے کی طرف دیکھا۔ سالار نے اسے بھی ٹھٹکتے دیکھا' پھر وہ مڑی۔ اس کی پشت ایک بار پھر سالار کی طرف تھی۔ سالار نے اسے جھکتے اور چارپائی سے دوپٹہ اٹھاتے دیکھا۔ دوپٹے کو سینے پر پھیلاتے ہوئے اس نے اس کے ایک پلو کے ساتھ اپنے سر اور پشت کو بھی ڈھانپ لیا تھا۔

سالار اب اس کی پشت پر بکھرے بال نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اسے آمنہ کے اطمینان نے حیران کیا تھا۔ وہاں کوئی گھبراہٹ' کوئی جلدی' کوئی حیرانی نہیں تھی۔

سعیدہ اماں نے مڑ کر سالار کو دیکھا پھر اسے دروازہ میں ہی کھڑے دیکھ کر انہوں نے کہا۔

"ارے بیٹا! وہاں کیوں کھڑے ہو' اندر آؤ۔ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔"

آمنہ نے دوپٹہ اوڑھنے کے بعد مڑ کر اسے ایک بار پھر دیکھا تھا۔ وہ اب بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر' دم بخود' بے حس و حرکت۔

آمنہ کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ اب آگے آ گیا تھا۔

"یہ آمنہ ہے' میری بیٹی۔" سعیدہ اماں نے اس کے قریب آنے پر تعارف کروایا۔

"السلام علیکم!" سالار نے آمنہ کو کہتے سنا۔ وہ کچھ بول نہیں سکا۔ وہ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اسے دیکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

وہ نروس ہو رہا تھا۔ آمنہ نے اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔

"سالار! تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔"

سعیدہ اماں نے آمنہ کو بتایا۔

آمنہ نے ایک بار پھر سالار کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں نے بیک وقت نظریں چرائیں۔

آمنہ نے سعیدہ اماں کو دیکھا اور سالار نے آمنہ کی کلائیوں تک مہندی کے نقش و نگار سے بھرے ہاتھوں کو۔

یک دم اسے لگا کہ وہ اس لڑکی سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

"سالار بیٹا! اندر کمرے میں چلتے ہیں۔ وہاں تم اطمینان سے آمنہ سے بات کر لینا۔"

سعیدہ اماں نے اس بار سالار کو مخاطب کیا۔

سعیدہ اماں کہتے ہوئے اندر برآمدے کی طرف بڑھیں۔ سالار نے آمنہ کو سر جھکائے ان کی پیروی کرتے دیکھا۔ وہ وہیں کھڑا اسے اندر جاتا دیکھتا رہا۔ سعیدہ اماں کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔ آمنہ نے دروازے کے پاس پہنچ کر مڑتے مڑتے اسے دیکھا۔ سالار نے برق رفتاری سے نظر جھکا لیں۔ آمنہ نے مڑ کر اسے دیکھا پھر شاید وہ حیران ہوئی۔ سالار اندر کیوں نہیں آ رہا تھا۔ سالار نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر جھکائے قدم آگے بڑھا دیئے۔ آمنہ کچھ مطمئن ہو کر مڑ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔

سالار جب کمرے میں داخل ہوا تو سعیدہ اماں پہلے ہی ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھیں۔ آمنہ لائٹ آن کر رہی تھی۔ سالار کو دھوپ سے اندر آ کر خنکی کا احساس ہوا۔

"بیٹھو بیٹا!" سعیدہ اماں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ سالار کرسی پر بیٹھ گیا۔ آمنہ لائٹ آن کرنے کے بعد اس سے کچھ فاصلے پر ان کے بالمقابل ایک کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

سالار منتظر تھا کہ سعیدہ اماں چند لمحوں میں وہاں سے اُٹھ کر چلی جائیں گی۔ فرقان نے واضح طور پر انہیں بتایا تھا کہ وہ اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا' مگر چند لمحوں کے بعد سالار کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا یہ انتظار بے کار تھا۔ وہ شاید یہ بھول گئی تھیں کہ سالار تنہائی میں آمنہ سے ملنا چاہتا تھا یا پھر ان کا یہ خیال تھا کہ وہ تنہائی صرف فرقان کی عدم موجودگی کے لئے تھی۔ سالار نے انہیں اس میں شامل نہیں کیا ہوگا یا پھر وہ ابھی سالار کو اتنا قابل اعتبار نہیں سمجھتی تھیں کہ اپنی بیٹی کے

ساتھ اسے اکیلا چھوڑ دیتیں۔

سالار کو آخری اندازہ صحیح لگا۔ وہ اس سے جو کچھ اور جتنا کچھ کہنا چاہتا تھا' سعیدہ اماں کے سامنے نہیں کہنا چاہتا تھا' وہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو کھنگالنے کی کوشش کی۔ اسے کچھ تو کہنا ہی تھا وہ کچھ نہیں ڈھونڈ سکا۔ اس کا ذہن خالی تھا۔

نیم تاریک خنک کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ وہ اب دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے فرش پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

آمنہ نے کمرے میں کوئی فینسی لائٹ روشن کی تھی۔ اونچی دیواروں والا فرنیچر سے بھرا ہوا وہ وسیع و عریض کمرہ شاید سٹنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں بہت زیادہ دروازے تھے اور تمام دروازے بند تھے۔ کمرے میں موجود واحد کھڑکی برآمدے میں کھلتی تھی اور اس کے آگے پردے تھے۔ فرش کو بھاری بھرکم میرون نقش و نگار کے قالین سے ڈھکا گیا تھا اور فینسی لائٹ کمرے کو پوری طرح روشن کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

کم از کم کمرے میں سالار کو تاریکی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ اس کے احساسات تھے یا پھر۔

مجھے اپنے Optician سے آج ضرور ملنا چاہئے۔ قریب کے ساتھ ساتھ شاید میری دور کی نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔"

سالار نے مایوسی سے سوچا۔ سینٹر ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھی آمنہ کو وہ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر نظر قالین پر جما دی پھر اس نے یک دم آمنہ کو اٹھتے دیکھا۔ وہ دیوار کے پاس جا کر کچھ اور لائٹس آن کر رہی تھی۔ کمرہ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں جگمگا اٹھا۔ فینسی لائٹ بند ہو گئی۔ سالار حیران ہوا۔ آمنہ نے پہلے ٹیوب لائٹ آن کیوں نہیں کی تھی' پھر اچانک اسے احساس ہوا وہ بھی نروس تھی۔

آمنہ دوبارہ پھر اس کے سامنے کاؤچ پر آ کر نہیں بیٹھی۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر سعیدہ اماں کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ سالار نے اس بار اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسی طرح قالین کو گھورتا رہا۔ سعیدہ اماں کا صبر بالآخر جواب دے گیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کھنکھار کر سالار کو متوجہ کیا۔

"کرو بیٹا! وہ باتیں جو تم نے آمنہ سے تنہائی میں کرنی تھیں۔"

انہوں نے سالار کو بڑے پیار سے یاد دلایا۔

"اتنی دیر سے چپ بیٹھے ہو' میرا تو دل ہول رہا ہے۔"

سالار نے ایک گہرا سانس لیا' پھر سعیدہ اماں اور آمنہ کو باری باری دیکھا۔

"کچھ نہیں' میں بس انہیں دیکھنا چاہتا تھا۔"

اس نے اپنے لہجے کو حتی الامکان ہموار رکھتے ہوئے کہا۔ سعیدہ اماں کے چہرے پر بشاشت آ گئی۔

"تو اتنی سی بات تھی اور فرقان نے مجھے ڈرا ہی دیا۔ ہاں ہاں ضرور دیکھو' کیوں نہیں۔ بیوی ہے تمہاری۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ ان سے کہہ دیں کہ سامان پیک کر لیں' میں باہر انتظار کرتا ہوں۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھتا ہوا سعیدہ اماں سے بولا۔ آمنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ سعیدہ اماں بھی حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"مگر بیٹا! تم تو صرف کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے اس سے' پھر رخصتی ...... میرا مطلب ہے میں چاہتی تھی باقاعدہ رخصت کروں اور......"

سالار نے نرمی سے سعیدہ اماں کی بات کاٹی۔

"آپ یہ سمجھ لیں کہ میں باقاعدہ رخصت کروانے کے لئے ہی آیا ہوں۔"

سعیدہ اماں کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

"ٹھیک ہے بیٹا! تم اگر ایسا چاہتے ہو تو ایسا ہی سہی مگر افطار کے لئے رکو۔ چند گھنٹے ہی باقی ہیں' کھانا تو کھا کر جاؤ۔"

"نہیں' مجھے اور فرقان کو کچھ کام ہے۔ میں اسے صرف ایک گھنٹے کے لئے لے کر آیا تھا۔ زیادہ دیر رُکنا ممکن نہیں ہے میرے لئے۔" وہ کھڑے کھڑے کہہ رہا تھا۔

"لیکن اماں! مجھے تو سامان پیک کرنے میں بہت دیر لگے گی۔"

آمنہ نے وہیں کرسی پر بیٹھے ہوئے پہلی بار ساری گفتگو میں حصہ لیا۔ سالار نے مڑ کر اسے دیکھے بغیر سعیدہ اماں سے کہا۔

"سعیدہ اماں! آپ ان سے کہیں یہ آرام سے پیکنگ کر لیں' میں باہر انتظار کروں گا۔ جتنی دیر یہ چاہیں۔"

وہ اب کمرے سے نکل گیا تھا۔

لاحاصل

سین 14

ذالعید نے گھر کے بیرونی دروازے کو کھول دیا۔ رات کے اس پچھلے پہر پورا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''اور ماما جان ...... ماما جان کبھی گھر کو تاریک نہیں رکھتی تھیں۔'' کھلے دروازے سے گھر کے صحن میں داخل ہوتے ہوئے مریم نے سوچا۔ گلی میں جلنے والے بلبوں کی روشنی گھر کو مکمل تاریک ہونے سے بچا رہی تھی۔ وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح صحن میں چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ ذالعید بھی اب دروازہ بند کر کے اندر آ چکا تھا۔

''میں لائٹ جلاتا ہوں۔'' اپنی پشت پر اسے ذالعید کی مدھم آواز سنائی دی۔

''نہیں' لائٹ آن مت کرو ...... سب کچھ تاریک رہنے دو ...... روشنی میں میں اس گھر کا سامنا نہیں کر سکتی ...... روشنی میں یہاں کھڑے ہونے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی۔'' العید نے اس کی آواز میں اترتی ہوئی نمی کو محسوس کیا۔ وہ برآمدے کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔

صحن کے اطراف دیوار کے ساتھ کیاریوں میں لگے ہوئے پودوں کو ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے ہلا رہے تھے۔ وہ چپ چاپ ان پودوں کو دیکھتی رہی۔ گھر کی دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ وہ پودے بھی صرف ماما جان ہی کا شوق تھے۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر انہیں پانی دیا کرتی تھیں۔ ہر ہفتے کھرپے سے کیاریوں کی مٹی نرم کرتی رہتی تھیں۔ ان پودوں پر لگنے والی کلیوں کو گنتی رہتیں ...... اس نے گلاب اور موتیے کے پودوں کو اندھیرے میں پہچاننے کی کوشش کی۔

''میں نے مرغیوں اور طوطے کے پنجرے کو ساتھ والے گھر میں دے دیا ہے۔ اکیلے گھر میں وہ نہیں رہ سکتے تھے۔'' مریم نے ذالعید کو کہتے سنا۔

''اور بلی ......؟'' مریم نے بے اختیار پوچھا۔

''وہ یہیں کہیں ہے' میں اسے کہاں دے سکتا تھا؟ وہ سارا دن اسی کمرے کے باہر برآمدے میں بیٹھی رہتی ہے ساتھ والے گھر کے لوگ اسے دن میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتے ہیں۔''

وہ اب برآمدے میں جا کر اندھیرے میں کمرے کے دروازے کا تالا کھول رہا تھا۔ وہ

وہیں صحن میں کھڑی نیم تاریکی میں اس کی پشت دیکھتی رہی۔ پھر وہ کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ مریم نے کمرے میں روشنی ہوتے دیکھی۔ وہ بے اختیار صحن سے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ آئی اور بہت آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ذالعید بازو سینے پر لپیٹے کمرے کے وسط میں بالکل خاموش کھڑا تھا۔

''آپ کو پتا ہے ماما جان! آپ نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ آپ نے مجھے دوزخ میں رکھا ہوا ہے ...... نہ میں یہاں جی سکتی ہوں ...... نہ مر سکتی ہوں ...... میں یہاں خوش نہیں ہوں۔ میں یہاں خوش رہ ہی نہیں سکتی ...... میری منزل یہ ایک کمرہ نہیں ہے ...... مجھے گھن آتی ہے اس جگہ سے ...... اس گھر سے ...... اس کمرے سے ...... یہاں کی ہر چیز سے۔'' اس کی اپنی آواز اس کی سماعتوں میں گونجنے لگی تھی۔

وہ خشک آنکھوں کے ساتھ کمرے میں پڑی چیزوں کو دیکھتی رہی۔ ماما جان کی چارپائی اب بھی وہیں تھی۔ ساتھ کے گھر والوں نے شاید ماما جان کے سوئم کے بعد گھر کی صفائی کی تھی کیونکہ کمرہ بالکل صاف تھا اور چیزوں کو سمیٹ دیا گیا تھا۔

''اُمّ مریم! تم میری زندگی ہو۔'' اسے یاد تھا' وہ اس دن کمرے میں کس جگہ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل گر کر گڑگڑائی تھیں۔

''اُمّ مریم تمہاری موت ہے۔'' اس نے کیا کہا تھا اسے یہ بھی یاد تھا۔ وہ چپ چاپ کمرے کی چیزوں کو دیکھتی رہی۔ ان چیزوں کو جن سے اسے گھن آتی تھی۔

یہ ایک کمرے کا گھر ماما جان کی جنت تھا اور اسے اس جنت میں پیدا نہ ہونے کے باوجود اللہ نے وہیں بھیج دیا تھا۔ مگر اس نے جنت سے نفرت کرنی شروع کر دی تھی۔ اسے جہنم کی طلب ہونے لگی تھی۔ یہ طلب بڑھتے بڑھتے ہوس بن گئی تھی۔ پھر اس ہوس نے جنت کو آگ لگا دی۔ سب کچھ جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

''میں ذالعید کو کبھی تمہارے پاس نہیں جانے دوں گی۔ وہ میرا ''حاصل'' ہے۔ میں ہر اس دوسری عورت کو قبر میں اتار دوں گی جو میرے اور اس کے درمیان آئے گی۔'' وہ الٹے قدموں کمرے سے نکل آئی کمرہ یک دم جیسے ایک گنبد بن گیا تھا جہاں اس کی آواز گونج بن کر دیواروں سے ٹکراتی پھر رہی تھی۔

''آپ دیکھ لینا ماما جان ......! میں کبھی نہ کبھی اس گھر سے بھاگ جاؤں گی۔ مجھے ایک کمرے کے اس ٹوٹے پھوٹے گھر سے نفرت ہے۔ یہ گھر کبھی میرے خوابوں میں نہیں آیا ...... میں نے کبھی بھی خود کو یہاں نہیں پایا۔'' وہ برآمدے میں رک گئی۔

ذالعید کمرے کی لائٹ بند کر کے باہر آ گیا۔ ایک بار پھر ہر طرف وہی تاریکی ہو گئی۔

ذالعید صحن کو برآمدے سے جوڑنے والی دو سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ وہ صحن کے وسط میں کھڑی تھی۔ آسمان بادلوں سے بالکل ڈھک گیا تھا۔

''بہت سی چیزیں تمہیں میں نہیں وقت سکھائے گا ...... مگر تب تک بہت دیر ہو چکی ہو گی۔'' اس کی سماعتوں میں ماما جان کی نرم اور مدھم آواز لہرائی۔ اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''میرے پاس اللہ کی ہر نعمت ہے ...... مسلمان ہوں ...... شادی ہوئی ...... تم ہو ...... گھر ہے ...... کبھی بھوکا سونا نہیں پڑا ...... اور ...... اور میرے شوہر نے بھی مجھ سے بہت محبت کی ...... اس سے زیادہ میں کس چیز کی خواہش کر سکتی تھی۔'' اس کی آنکھوں میں پانی بھرنا شروع ہو گیا۔

وہ جس زمین پر کھڑی تھی اس زمین کو ماما جان نے اپنے ہاتھوں سے مٹی کا لیپ کیا تھا۔ اس نے اپنے جوتے اتار دیئے۔ اسے زمین میں ماما جان کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔

''آپ کس چیز کا شکر ادا کرنے کے لیے اتنی نمازیں پڑھتی ہیں۔ کس احسان کے صلے میں راتوں کو تہجد کے لیے جاگتی ہیں ...... اس خستہ حال گھر کے لیے ...... دوگنی عمر کے اس بدصورت شوہر کے لیے جس نے دھوکا دے کر آپ سے شادی کی یا اس دو ہزار روپے کے لیے جس سے ایک ماہ میں تین وقت کے کھانے کے علاوہ اور کچھ کھایا نہیں جا سکتا۔'' اس کی باتوں میں کتنے نشتر تھے جو ماما جان کو چبھتے ہوں گے۔ اسے اب محسوس ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا ماما جان! اگر اللہ سے صرف ایک چیز چاہیے ہو اور وہی نہ ملتی ہو۔'' اس نے پلٹ کر ذالعید کو دیکھا۔ وہ سیڑھیوں میں بیٹھا دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپے ہوئے تھا۔ اس کے گال بھیگنے لگے۔

''میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ میری اُمّ مریم کو ہمیشہ اپنی رحمت اور کرم میں رکھے۔ اسے کبھی گناہ کے رستے پر نہ چلائے ...... میری اُمّ مریم کو جنت میں بھی میرے پاس رکھے ...... اسے قناعت کی دولت دے دے۔'' اس کا جسم اب لرزنے لگا تھا۔

''آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے ماما جان! ورنہ آپ میرے لیے یہ سب کچھ نہ مانگتیں ...... آپ اُمّ مریم کے لیے ''دنیا'' مانگتیں۔'' وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑی۔

اس جگہ اس نے ماما جان کو بہت بار تہجد پڑھتے دیکھا تھا۔ وہ بچپن میں رات کو جاگنے پر ماما جان کو اپنے پاس نہ پاتی تو پھر کمرے سے اٹھ کر باہر صحن میں ان کے پاس آ جاتی۔ وہ تہجد پڑھ رہی ہوتیں۔ وہ خاموشی سے ان کے پاس زمین پر لیٹ کر سو جاتی۔

وہ اب اپنے ہاتھ زمین پر پھیر رہی تھی یوں جیسے ماما جان کے ہاتھوں کے لمس کو محسوس کرنا چاہتی ہو۔ ''انسان ٹوٹی دیواروں' اکھڑے فرش' رستی ہوئی چھت' چار چھ جانوروں' دس بارہ پودوں اور خواہشوں کی قبروں کے ساتھ کتنی دیر خوش رہ سکتا ہے بلکہ کتنی دیر ''رہ'' سکتا ہے اور آخر

انسان رہے کیوں؟ اگر اس کے پاس بہتر مواقع ہیں۔''

''بہتر مواقع؟'' وہ بڑبڑائی اور اس کا وجود جیسے کسی زلزلے کی زد میں آ گیا تھا۔

ذالعید نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ صحن کے وسط میں کسی ننھے بچے کی طرح گھٹنوں کے بل بیٹھی بلک رہی تھی۔ اس کا سکتہ ٹوٹ چکا تھا۔ گھر میں پھیلی ہوئی خاموشی اس کے بلند آواز میں رونے کی وجہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ وہ چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اس نے اس کے پاس جانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسے رونے دینا چاہتا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی اسے کون سی چیز رلا رہی تھی اس کے اپنے لفظوں کے نشتر یا پھر ملال ...... اندر ہونے والی چبھن کس چیز کی تھی ...... ضمیر کی ...... یا پچھتاوے کی ......

''کاش ماما جان! آپ نے میرے لیے دنیا نہ مانگی ہوتی ...... کاش ذالعید کو میرا مقدر بن جانے کے لیے ہاتھ نہ اٹھائے ہوتے ...... شاید اس لمحے آپ نے میرے لیے قناعت مانگی ہوتی تو مجھے قناعت مل جاتی۔'' اس کے وجود میں حشر برپا تھا۔

''مجھے اللہ نے ایک ایسی عورت کے پاس بھیجا جس کے پاس سب کچھ تھا ...... میں نے پچیس سال اس کے پاس گزارے اور میں نے اس سے کچھ بھی نہیں لیا ...... میں نے ''دنیا'' لی اور یہ شخص ...... یہ شخص صرف تین سال میں ماما جان سے سب کچھ لے گیا۔ قناعت' برداشت' عفو' رحم سب کچھ ...... میں نے خسارے کا سودا کیا اور مجھے ...... مجھے پتا تک نہیں چلا ...... کیا دنیا میں مجھ سے بڑھ کر کوئی احمق ہو سکتا ہے ...... کیا دنیا میں مجھ سے بڑھ کر کوئی احسان فراموش ہو سکتا ہے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے پیروں میں لاحاصل خواہشوں کے ایسے بھنور باندھ لیے ہیں جو ساری عمر میرے وجود کو گردش میں رکھیں گے۔ خدیجہ نور جیسا سکون مجھے کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ خدیجہ نور جیسی قناعت میری زندگی میں کبھی نہیں آئے گی کیوں اتنی ہوس' اتنی حرص میرے اندر آ گئی کہ میں نے سکون کی جنت کو خواہش کی آگ سے پھونک ڈالا۔ آسمان سے پانی کے قطرے گرنے لگے۔ آج زندگی میں پہلی بار اس صحن میں بیٹھ کر اسے بارش بری نہیں لگی۔ آج پہلی بار اسے اپنے علاوہ کچھ بھی بُرا نہیں لگا۔ بارش کے قطرے اس کے کچھ اور زخموں کو ہرا کرنے لگے۔ آج ہر چیز کے منہ میں زبان آ گئی تھی۔ ہر چیز بولنے لگی تھی۔

''آپ کو کیا پتا ماما جان! محبت کیا ہوتی ہے۔ آپ نے محبت کی ہوتو ......'' وہ بے تحاشا روتی گئی۔

''کاش ماما جان! میں اُمّ مریم نہ ہوتی' آپ کا پالا جانے والا کوئی جانور ہوتی جو آپ کا وفادار تو ہوتا۔ کاش ماما جان! میں مصورہ نہ ہوتی۔ میرے پاس کوئی ہنر نہ ہوتا' ایسا ہنر جس نے مجھے گمان اور خودفریبی کی آخری حد پر لے جا کر کھڑا کر دیا' کاش میں ......'' بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔

ذالعید نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ وہیں صحن کے وسط میں گھٹنوں کے بل بیٹھی مٹھیاں بھینچے بلک رہی تھی۔ تیز بارش ہر چیز کو بھگو رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس نے کمرے کے دروازے کو تالا لگا دیا۔

برستی بارش میں وہ اس کے پاس آ کر پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ ''ماما جان کہتی تھیں۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''صرف کچھ وقت لگے گا پھر تم واپس آ جاؤ گی۔ وہ کہتی تھیں میں نے پچیس سال اس کے وجود پر اتنی آیتیں پڑھ کر پھونکی ہیں کہ اب اللہ اسے جہنم کا ایندھن تو نہیں بنائے گا۔'' اس کے آنسو تھمنے لگے۔

تیز بارش کی بوچھاڑ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے چہرے کو بری طرح بھگو رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔

''وہ کہتی تھیں۔ میں نے اُمّ مریم کو کبھی حرام نہیں کھلایا۔ اس کے خون میں حلال کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ جانتے بوجھتے خود کو جہنم میں جا پھینکے۔ کچھ وقت لگے گا مگر وہ واپس آ جائے گی۔ برائی سے واپس اچھائی کی طرف۔ میری طرفؑ' تمہاری طرف' زینب کی طرف ...... جب اسے دنیا کی سمجھ آنے لگے گی تو پھر وہ دنیا کے پیچھے نہیں بھاگے گی۔ ماما جان کو یقین تھا تم سب کچھ سمجھ جاؤ گی۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

برستی بارش کی بوچھاڑ کے درمیان وہ دونوں ایک دوسرے کا چہرے دیکھتے رہے۔ مریم نے گردن موڑ کر برآمدے کی طرف دیکھا۔ اب وہاں اندھیرا تھا۔ ذالعید اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر مریم کو اٹھایا۔

صحن کے دروازے کی طرف ذالعید کے پیچھے جاتے ہوئے مریم نے ایک بار پلٹ کر دیکھا۔

''ماما جان نے تمہیں صرف ایک بات نہیں بتائی ذالعید کہ جب میں سنبھلوں گی' تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔'' اس نے تھکے ہوئے انداز میں زیرلب دہرایا اور ذالعید کے پیچھے دہلیز پار کر گئی۔

پیرِ کامل

سین 15

''کہاں چلے گئے تھے تم؟'' سعد اسے دیکھتے ہی چلایا۔ وہ کچھ کہے بغیر اندر چلا آیا۔

''میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔'' سعد دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے آ گیا۔ سالار اپنی جیکٹ اُتار رہا تھا۔

''کہیں نہیں گیا تھا۔'' اس نے جیکٹ لٹکاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پتا ہے کہ میں نے تمہیں کتنا تلاش کیا ہے' کہاں کہاں فون کئے ہیں اور اب تو میں اتنا پریشان ہو چکا تھا کہ پولیس کو فون کرنے والا تھا ...... تم آخر اس طرح نماز چھوڑ کر گئے کہاں تھے؟''

سالار کچھ کہے بغیر اپنے جاگرز اُتارنے لگا۔

''میں نے تمہیں بتایا ہے' کہیں نہیں۔''

''تو پھر اب تک کہاں تھے؟'' سعد اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''وہیں تھا' مسجد کے پچھلے حصے میں فٹ پاتھ پر۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''واٹ! اتنے گھنٹے تم وہاں فٹ پاتھ پر برف میں بیٹھے رہے ہو۔'' سعد دم بخود رہ گیا۔

''ہاں!''

''کوئی تک بنتی ہے اس حرکت کی۔'' وہ کچھ جھلایا۔

''نہیں' کوئی تک نہیں بنتی۔'' سالار نے اسی طرح سیدھا بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

''کچھ کھایا ہے؟''

''نہیں۔''

''تو کھانا کھالو۔''

''نہیں' بھوک نہیں ہے۔'' وہ اب چھت پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ سعد اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟ بتا سکتے ہو مجھے۔'' سالار نے گردن کو ہلکی سی حرکت

دے کر اسے دیکھا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' بے تاثر لہجے میں کہا گیا۔ ''میں سمجھا' تم اپنے اپارٹمنٹ چلے گئے ہو' مگر وہاں بار بار رنگ کرنے پر بھی تم نہ ملے۔'' سعد بڑبڑا رہا تھا۔ سالار کی نظریں چھت پر ہی تھیں۔

''اس سے بہتر تھا کہ میں تمہیں اپنے ساتھ نماز پڑھنے لے کر ہی نہ جاتا۔ آئندہ میرے ساتھ مت جانا تم۔'' سعد نے ناراضی سے کہا۔ وہ اب اس کے بیڈ سے اُٹھ گیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے کام نبٹاتا رہا پھر وہ نائٹ بلب آن کر کے اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس نے ابھی آنکھیں بند کی تھیں' جب اس نے سالار کی آواز سنی۔

''سعد!''

''ہاں!'' اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''یہ ''صراطِ مستقیم'' کیا ہوتا ہے؟''

سادہ لہجے میں پوچھے گئے سوال نے سعد کو حیران کر دیا۔ اس نے گردن موڑ کر بائیں جانب بیڈ پر سیدھا لیٹے ہوئے سالار کو دیکھا۔

''صراطِ مستقیم ...... سیدھے راستے کو کہتے ہیں۔''

''جانتا ہوں مگر سیدھا راستہ کیا ہوتا ہے؟'' اگلا سوال آیا۔

سعد نے اس کی طرف کروٹ لے لی۔ ''سیدھا رستہ ...... مطلب نیکی کا رستہ ......''

''نیکی کیا ہوتی ہے؟'' لہجہ ابھی بے تاثر تھا۔

''اچھے کام کو نیکی کہتے ہیں۔''

''اچھا کام کیا ہوتا ہے؟''

''اچھا کام ...... کوئی ایسا کام جو کسی دوسرے کے لئے کیا گیا ہو۔ کسی کی مدد کی گئی ہو' کسی پر مہربانی کی گئی ہو' وہ اچھا کام ہوتا ہے اور ہر اچھا کام نیکی ہوتی ہے۔''

''ابھی کچھ گھنٹے پہلے میں نے وہاں فٹ پاتھ پر ایک hooker کو پچاس ڈالر دیئے' جبکہ وہ صرف تیس ڈالر مانگ رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے یہ نیکی ہوئی؟''

سعد کا دل چاہا وہ ایک گھونسا اس کے منہ پر کھینچ مارے' وہ عجیب آدمی تھا۔

''بکواس بند کرو اور سو جاؤ' مجھے بھی سونے دو۔'' اس نے کمبل لپیٹ لیا۔

سالار کو حیرت ہوئی' وہ کس بات پر ناراض ہوا تھا۔ ''تو یہ نیکی نہیں ہوئی؟''

''میں نے تم سے کہا ہے' اپنا منہ بند کرو اور سو جاؤ۔'' سعد ایک بار پھر دھاڑا۔

''اتنا ناراض ہونے کی ضرورت تو نہیں ہے' میں نے تم سے ایک بہت معمولی سا سوال

کیا ہے۔'' سالار نے بڑے تحمل سے کہا۔

سعد یک دم کچھ مشتعل ہوتے ہوئے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس نے لیمپ آن کر دیا۔

''تمہارے جیسے آدمی کو میں کیا صراطِ مستقیم سمجھاؤں۔ کیا تم پاگل ہو یا جاہل ہو ...... یا غیر مسلم ہو ...... کیا ہو ...... کچھ بھی نہیں ہو ...... تمہیں خود پتا ہونا چاہئے کہ صراطِ مستقیم کیا ہوتا ہے مگر تم جیسا آدمی جو مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے نماز درمیان میں چھوڑ کر چلا آتا ہے' وہ کیسے جان سکتا ہے یہ۔''

''میں نماز اس لئے چھوڑ کر چلا آیا کیونکہ تم کہتے ہو اس میں سکون ملے گا۔ مجھے سکون نہیں ملا' میں چھوڑ آیا۔'' اس کے پُرسکون انداز میں کہے ہوئے جملے نے سعد کو مزید مشتعل کیا۔

''تمہیں نماز میں اس لئے سکون نہیں ملا' کیونکہ مسجد تمہاری جگہ نہیں ہے' تمہارے لئے سکون کی جگہیں سینما' تھیٹر' بار اور کلب ہیں۔ مسجد تمہارے لئے نہیں ہے۔ تمہیں نماز میں سکون کہاں سے مل جاتا ...... اور تم چاہتے ہو' میں تمہیں بتاؤں صراطِ مستقیم کیا ہوتا ہے۔''

وہ بیڈ پر سیدھا لیٹا پلکیں جھپکائے بغیر سعد کو دیکھتا رہا۔

''تمہارے جیسا شخص جو نماز سے بھاگ جاتا ہے' شراب پیتا اور زنا کرتا ہے۔ وہ صراطِ مستقیم کے مطلب کو سمجھ سکتا ہے نہ اس پر آ سکتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے جو شراب پیتے اور زنا کرتے ہیں مگر نماز سے بھاگتے نہیں' نماز بھی پڑھ لیتے ہیں' وہ صراطِ مستقیم کا مطلب سمجھتے ہیں اور صراطِ مستقیم پر ہیں۔''

سعد کچھ بول نہیں سکا۔ مدھم آواز اور بے تاثر لہجے میں کئے گئے ایک ہی سوال نے اسے خاموش کر دیا تھا۔ سالار اب بھی اسی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتے سالار!'' اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

سالار کے کانوں میں ایک جھماکے کے ساتھ ایک دوسری آواز گونج اُٹھی تھی۔

''ہاں' میں واقعی نہیں سمجھ سکتا۔ لائٹ آف کر دو' مجھے نیند آ رہی ہے۔'' اس نے مزید کچھ کہے بغیر آنکھیں بند کر لیں۔

دربارِ دل

سین 16

اس رات میں نے تہجد کے ساتھ ساتھ عشاء کی نماز بھی نہیں پڑھی...... اس کی آواز مسلسل میرے ذہن میں گونج رہی تھی ......محبت ......محبت ......محبت ...... میں تم سے محبت کرتا ہوں ......ایک جملہ تھا جو میرے وجود کو بھنور بنائے ہوئے تھا...... آخر یہ ممکن ہی کیسے تھا کہ ...... اور اس کہ کے بعد آنے والے جملے کا جواب میرے پاس نہیں تھا ......کسی کے پاس بھی نہیں ہوتا اور کسی کو اس سوال کے جواب کی تلاش بھی نہیں ہوتی بلکہ کوئی یہ سوال کرتا ہی نہیں ...... ہر ایک کے لیے یہ ہی کافی ہوتا ہے کہ اس سے ''کوئی'' محبت کرتا ہے۔ صرف میں تھی جو ایک اعتراف کو سوال بنائے بیٹھی تھی ...... کسی نے میرے پورے وجود کو جیسے محبت کی میخوں سے ٹھونک دیا تھا...... اور میں میں زندگی میں پہلی بار دربارِ دل میں داخل ہو رہی تھی ...... اور وہاں دل اپنے تخت پر بڑے تنفر اور تمکنت کے ساتھ براجمان تھا...... عجیب غرور تھا اس کے وجود میں ...... اور اس کے دربار میں ہر کوئی گھٹنوں کے بل گرا ہوا تھا......صرف میں تھی جو اپنے پیروں پر چلتی ہوئی وہاں آئی تھی......شاید کبھی وہ سب بھی اپنے پیروں پر چلتے ہوئے ہی وہاں آئے ہوں گے......صرف میں تھی جو اپنے پیروں پر وہاں کھڑی تھی ......شاید وہ سب بھی وہاں اپنے پیروں پر کھڑے ہوں گے ...... اور صرف میں تھی جو وہاں تخت پر بیٹھے دل کے سامنے کھڑی اس کو دیکھ رہی تھی۔ اور دل ...... اس کے ہونٹوں پر عجب مسکراہٹ تھی۔ شاید وہاں آنے والا ہر کوئی پہلے یونہی دیکھتا ہوگا۔ تنی گردن' اٹھی ٹھوڑی سیدھے کندھے' تخت کے پار ہتھوں پر پھیلے بازو ...... وہ اپنے دربار میں بادشاہ تھا۔ وہ دربارِ دل تھا اور میں ...... میں ...... آخر میں وہاں کیوں آئی تھی؟ ...... یالائی گئی تھی۔

''نام؟......''

''مہرِ سمیع......''

''عمر؟......''

''20 سال......''

''جنس؟......''

''عورت......''

''محبت؟......''

''اندھی......''

میں نے چونک کر usher کو دیکھا ...... وہ کیا حد جاری کر رہا تھا مجھ پر؟ ......محبت اندھی؟ ...... اندھی محبت؟ ......تو میں اندھی محبت کا شکار ہوئی تھی۔ کسی نے قہقہہ لگایا۔ میں نے گردن موڑ کر تخت کو دیکھا۔ ''مہر سمیع ...... Blind love ......Rare species۔'' اس دربار کا حکمران مجھے دیکھتے ہوئے پسندیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ''Pure and Blind Love'' میں اسے رکھنا چاہوں گا۔ اس نے تالی بجائی...... کسی نے میرے وجود کو زنجیروں سے جکڑا...... پھر میں اوندھے منہ فرش پر گری۔

امربیل

سین 17

باہر عجیب سی خاموشی نے اس کا استقبال کیا تھا۔ دور بیرونی دیوار کے پاس لگی لائٹس اگرچہ تاریکی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھیں' لان بڑی حد تک تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا' تاریکی' خاموشی اور تنہائی اسے اس وقت ان ہی چیزوں کی ضرورت تھی۔

نیچے لان میں اترنے کے بجائے وہ ماربل کی سیڑھیوں میں سب سے اوپر والی سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ بایاں ہاتھ اپنی گود میں رکھتے ہوئے اس نے دایاں ہاتھ ماربل کے فرش پر رکھ دیا۔ فرش کی ٹھنڈک اسے پوروں کے ذریعے اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی۔

''تو آج بالآخر آپ کے یوٹوپیا کا خاتمہ ہو گیا اور اب ایلس ونڈر لینڈ سے باہر آ گئی ہے۔''

باہر کی خاموشی نے اس کے اندر کی خاموشی کو توڑ دیا تھا۔ وہ بہت آہستگی سے فرش پر انگلیوں کی پوریں پھیرنے لگی۔

''کاش معجزے ہونا بند نہ ہوتے' ایک معجزہ میری زندگی میں بھی ہوتا' میں آنکھیں بند کروں اور پھر کھولوں تو مجھے پتا چلے یہ سب خواب تھا۔ حقیقت یہ ہو کہ جنید کی جگہ پر عمر ہو جو ڈتھ اور جنید ہم دونوں کی زندگی میں موجود ہی نہ ہوں۔'' اس نے سوچتے ہوئے آنکھیں بند کیں پھر آنکھیں کھولیں۔ خواب ختم نہیں ہوا' حقیقت بدل نہیں سکی۔ وہ آنکھوں میں نمی لے کر مسکرائی۔

ہم کہ دشتِ جہاں کو آباد کیے بیٹھے ہیں
آرزوئے یار کو اب خاک کیے بیٹھے ہیں
خواب کے تار سے خواہش کو رفو کرتے
دامنِ دل کو اب چاک کیے بیٹھے ہیں

اس نے زیرِ لب اس غزل کے شعروں کو دہرانے کی کوشش کی جنہیں وہ دو سال سے بڑی باقاعدگی سے سنتی آ رہی تھی۔

کاش وہ آئے جلائے یہاں کوئی چراغ
دل کے دربار کو ہم طاق کیے بیٹھے ہیں

اس نے دور دیوار پر لگی ہوئی لائٹس پر نظریں جما دیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ لائٹس بھی بجھ جائیں۔ مکمل تاریکی' ویسی تاریکی جیسی اس وقت میرے اندر ہے۔ ''کیوں چند لمحوں کے لیے ویسی تاریکی نہیں ہو سکتی ہر طرف؟'' اس کے اندر خواہش ابھری۔

''علیزہ!'' اس نے بے اختیار گردن موڑ کر پیچھے دیکھا پھر اسی رفتار سے گردن واپس موڑی۔ وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانا چاہتی تھی' پھر اسے یاد آیا یہ کام پہلے ہی وہاں چھائی ہوئی تاریکی کر رہی تھی۔ اس نے بھی عمر کو اس کی آواز اور قد و قامت سے ہی پہچانا تھا' اور عمر نے اسے کیسے پہچانا تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔

وہ اتنے دبے قدموں آیا تھا کہ اسے اس کی آمد کی خبر ہی نہیں ہوئی یا پھر شاید وہ اپنی سوچوں میں اس قدر گم تھی کہ اپنے ارد گرد ہونے والی ہر چیز سے مکمل طور پر بے نیاز ہو گئی تھی۔

''تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہ اب اس کے عقب میں کھڑا پوچھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں ویسے ہی نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے باہر آ گئی۔'' اس نے اپنی آواز پر قابو رکھتے ہوئے اسے دیکھنے کی کوشش کیے بغیر کہا۔ اس کا خیال تھا' وہ اسے اندر جانے کا کہے گا...... یا پھر اندر جانے کی ہدایت دے کر خود چلا جائے گا...... ایسا نہیں ہوا۔

وہ اس کی بات کے جواب میں کچھ کہے بغیر اس کے عقب میں خاموشی سے کھڑا رہا۔

پھر علیزہ نے اسے چند قدم آگے بڑھتے اور اسی سیڑھی پر بیٹھتے دیکھا جس پر وہ بیٹھی تھی۔

اس کا دل چاہا وہ اٹھ کر وہاں سے بھاگ جائے یا پھر پوری قوت سے دھکا دے کر اسے وہاں سے دھکیل دے وہ چند لمحے اور اس کے پاس بیٹھتا تو اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی اس کی ساری کوششیں ناکام ہو جاتیں اور وہ اب عمر جہانگیر کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔

اس کی طرف دیکھے بغیر گردن سیدھی رکھے' وہ دور دیوار پر موجود لائٹس کو دیکھتی رہی مگر اس کی ساری حسیات بالکل بیدار تھیں۔ وہ اس کے سانس کی آواز سن رہی تھی۔ وہ اس کے کولون کی مہک کو محسوس کر رہی تھی۔ اسے اپنی گردن سیدھی رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ سیڑھیاں دونوں کے لیے نئی نہیں تھیں' وہ بہت بار وہاں بیٹھے تھے دن کی روشنی میں۔ رات کی تاریکی میں مگر اس بار خاموشی ایک تیسرے فرد کی طرح ان دونوں کے درمیان موجود تھی۔ پہلے وہ کبھی نہیں آئی تھی' وہ دونوں یہاں بیٹھ کر گپیں ہانکتے رہتے' گفتگو میں کسی بھی وقفے کے بغیر انہی سیڑھیوں پر بیٹھ کر عمر نے اسے بہت سے لطیفے سنائے تھے۔ وہ ہر بار لطیفہ سنانے سے پہلے اس سے کہتا۔ ''تمہیں ایک جوک سناتا ہوں۔''

علیزہ ہنسنا شروع ہو جاتی۔ ''کم آن یار! پہلے سن تو لو۔ تم تو پہلے ہی ہنسنا شروع ہو جاتی ہو۔'' وہ اسے ٹوکتا وہ سنجیدہ ہو جاتی۔

وہاں بیٹھے بیٹھے علیزہ کو بہت کچھ یاد آ رہا تھا' چاروں طرف چھائی تاریکی ایک ایسا گنبد بن گئی تھی جس کے اندر اسے اپنی اور عمر کی آوازوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ ''اور شاید آج ہم آخری بار یہاں ان سیڑھیوں پر ایک دوسرے کے اتنے قریب بیٹھے ہیں۔''

اس نے دل گرفتی کے عالم میں سوچا۔

''تم آج بہت اچھی لگ رہی تھیں۔'' عمر نے یک دم خاموشی کو توڑا۔

''تمہارے علاوہ ہر ایک کو۔'' اس نے سوچا۔

''جنید بہت خوش قسمت ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''اور میں بہت بدقسمت ہوں۔'' اس کے جواب اس کے اندر گونج رہے تھے۔

علیزہ کی مستقل خاموشی شاید اس کے لیے غیر متوقع تھی۔ وہ چند لمحوں کے لیے خود بھی خاموش ہو گیا۔

''آپ واپس نہیں گئے؟'' علیزہ نے اچانک اس سے پوچھا۔

''میں جانا چاہ رہا تھا...... گرینی نے روک لیا۔ سب فیملی ممبرز اکٹھے ہوئے تھے اس لیے۔'' وہ مدھم آواز میں بتانے لگا۔

''ابھی بھی سب اندر بیٹھے ہوئے ہیں ...... صرف میں باہر آیا ہوں۔ کچھ دیر واک کرنا چاہ رہا تھا۔ تمہیں دیکھا تو ادھر آ گیا۔''

وہ اب لائٹر سے ہونٹوں میں دبا ہوا ایک سگریٹ جلا رہا تھا۔ چند لمحے جلتے رہنے والے شعلے میں علیزہ نے اس کا چہرہ دیکھا پھر شعلہ بجھ گیا۔

عمر نے لائٹر واپس جیب میں نہیں رکھا...... وہ اسے ایک بار پھر جلا رہا تھا۔ اس بار وہ لائٹر جلا کر علیزہ کے ہاتھ کے پاس لے گیا۔ لائٹر سے اٹھنے والے شعلے کی روشنی میں علیزہ کے ہاتھ میں پہنی ہوئی انگوٹھی جگمگانے لگی تھی ...... وہ کچھ دیر اس کے ہاتھ میں موجود انگوٹھی کو دیکھتا رہا پھر اس نے لائٹر بند کر دیا۔ وہ اب اپنے بائیں ہاتھ سے سگریٹ کو ہونٹوں سے نکال رہا تھا۔ سگریٹ کا ننھا سا شعلہ اب اس کے ہونٹوں سے انگلیوں میں منتقل ہو چکا تھا۔ علیزہ اندھیرے میں ہونے والی اس حرکت کو دیکھتی رہی۔

''تم نے مجھ سے کوئی گفٹ نہیں مانگا؟'' کچھ دیر بعد اس نے مدھم آواز میں کہا۔ علیزہ کو اپنے حلق میں آنسوؤں کا پھندا لگتا ہوا محسوس ہوا۔

'گفٹ؟ جو کچھ تم مجھ سے لے چکے ہو...... اس کے بعد پوری دنیا اٹھا کر میرے سامنے رکھ دینے پر بھی میں خوش نہیں ہو سکتی۔'' اس کے اندر ایک اور سرگوشی ہوئی تھی۔

''تم مجھ سے بات نہیں کرو گی؟'' وہ بہت نرم آواز میں پوچھ رہا تھا۔ ''تمہاری ناراضی ختم

نہیں ہو گی؟''

وہ ساکت رہ گئی' وہ کس ناراضی کی بات کر رہا تھا کیا وہ جانتا تھا۔ وہ اس سے ناراض ہے اور اگر وہ یہ جانتا تھا تو پھر کیا اس کی ناراضی کی وجہ سے بھی واقف تھا پھر بھی وہ اب تک اتنی بے نیازی دکھا رہا تھا۔

''اندھیرے میں بیٹھ کر رونے کی عادت چھوڑ دو علیزہ۔'' اس کی نرم آواز اسے ایک چابک کی طرح لگی تھی ...... وہ ابھی بھی اس کی ساری کیفیات سے باخبر تھا...... اس نے خود کو بے بسی کی انتہا پر پایا۔

''میرے ساتھ یہ کیوں کیا آپ نے؟'' وہ یک دم پھٹ پڑی۔ ''آپ نے میری پوری زندگی تباہ کر دی ...... آپ نے مجھے میرے قدموں پر کھڑے رہنے کے قابل تک نہیں چھوڑا۔'' وہ بچوں کی طرح بلک رہی تھی۔

''مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے ...... مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ مجھے اپنی زندگی سے اس طرح باہر نکال کر پھینک سکتے ہیں۔'' وہ بالکل خاموش تھا۔

''جوڈتھ ...... آپ کس طرح اسے اپنی زندگی میں لا سکتے ہیں' کس طرح اسے میری جگہ دے سکتے ہیں۔''

''کیا ان سب باتوں کا اب کوئی فائدہ ہے؟'' اس کی آواز اب بھی اتنی ہی مدھم تھی۔

''کیوں فائدہ نہیں۔

کیوں فائدہ نہیں؟'' اس نے بلند آواز میں کہا۔

''آپ کو پتا ہے آپ نے کس طرح میری ذات کی نفی کی ہے ...... کس طرح crippled (بے بس) کر دیا ہے مجھے؟''

''علیزہ۔'' عمر نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر وہ بولتی رہی۔

''دس سال میں آپ کو ایک بار بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں آپ کے لیے عام فیلنگز نہیں رکھتی ...... میں آپ کی کزنز میں سے ایک اور کزن نہیں ہوں ...... میں آپ کی فرینڈز میں سے ایک اور فرینڈ نہیں ہوں۔ you always meant so much to me آپ نے کبھی ایسا سوچا ہی نہیں آپ کو کبھی اس کا احساس ہی نہیں ہوا۔ میں یقین نہیں کر سکتی' کبھی یقین نہیں کر سکتی۔''

وہ اب اس کے کندھے کو سختی سے پکڑے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میں نے تم سے کبھی کوئی وعدہ نہیں کیا ...... کیا کبھی میں نے تم سے کچھ کہا؟'' اس نے پُرسکون انداز میں پوچھا۔

وہ چند لمحوں کے لیے کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔

"تم اسے مانو یا نہ مانو مگر حقیقت یہی ہے کہ میں نے کبھی تمہارے بارے میں اس طرح سے سوچا ہی نہیں۔" وہ بہت نرمی سے اپنے کندھے کو اس کے ہاتھ کی گرفت سے چھڑا رہا تھا۔ وہ گیلے چہرے کے ساتھ اندھیرے میں اس کے چہرے کے نقوش کو کھوجتی رہی۔

"اگر مجھے تم میں کوئی دلچسپی ہوتی تو میں اتنے سالوں میں ضرور بتا دیتا۔ اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو اس کا صاف مطلب ایک ہی ہے ...... اور وہ وہی ہے جو تم سمجھنا نہیں چاہ رہیں۔"

عمر کے لہجے کی ٹھنڈک اور سرد مہری نے اسے عمر سے مزید برگشتہ نہیں کیا ...... اپنے کندھے سے اس کا ہاتھ ہٹانے سے بھی وہ دلبرداشتہ نہیں ہوئی۔

"تم بہت اچھی ہو ...... لیکن مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔" وہ بہت صاف اور واضح لفظوں میں کہہ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی اس کو کیا ہوا ...... وہ اندر نہیں بھاگی ...... وہ عمر پر نہیں چلائی ...... وہ ننھے بچوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو پکڑ کر اس کے کندھے سے سر ٹکائے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

"مجھ سے یہ مت کہو ...... تمہیں پتا ہے اس سے کتنی تکلیف ہوتی ہے مجھے۔"

عمر اب بالکل ساکت تھا یوں جیسے وہ پتھر کا کوئی مجسمہ ہو۔

"میرے ساتھ وہ سب کچھ مت کرو جو ذوالقرنین نے کیا ...... تم دنیا کے آخری آدمی ہو گے جس سے میں یہ توقع کر سکتی ہوں کہ وہ مجھ سے یہ کہے گا کہ اسے مجھ سے محبت نہیں ہے۔" وہ اسی طرح روتی رہی۔

"میں کبھی جنید کے ساتھ وفادار نہیں ہو سکتی۔ میں کبھی کسی کے ساتھ وفادار نہیں ہو سکتی ...... تم کیوں نہیں سمجھتے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزار سکتے ہیں ...... ہم دونوں اب بھی اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اگر تم چاہو تو ......"

"اور میں ایسا نہیں چاہتا۔" اس کی پرسکون آواز میں کوئی اضطراب تھا نہ ارتعاش ...... وہ اب بھی اپنی بات پر اسی طرح اڑا ہوا تھا۔ اس کے بازو پر علیزہ کی گرفت اور سخت ہو گئی۔

"تم کیوں نہیں چاہتے ...... ؟ تم کیوں نہیں چاہتے؟" وہ اس کے بازو سے ماتھا ٹکائے بچوں کی طرح بے تحاشا روتی گئی۔ عمر نے بازو پر اس کے آنسوؤں کی نمی کو محسوس کیا۔

"مجھے آج یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" عمر بڑبڑایا۔ "میں نے یہاں آ کر غلط کیا۔"

علیزہ نے اس کے کندھے پر ٹکا سر اٹھا کر اندھیرے میں دھندلی آنکھوں کے ساتھ اسے تلاش کرنے کی کوشش کی اور بہت سالوں کے بعد پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنی زندگی کے دس سال ایک غلط شخص کے لیے ضائع کر دیئے۔ اس کے نزدیک علیزہ کی کیا اہمیت تھی؟ اس کے نزدیک اس کے آنسو کیا معنی رکھتے تھے ...... ؟ اس کے نزدیک اس کی خوشی کی کیا حیثیت تھی ......

اس کے نزدیک علیزہ کیا تھی ...... ؟

دس سالوں کے بعد پہلی بار اس نے آئینے میں اپنے چہرے کو آنکھیں بند کر کے دیکھنے کی کوشش کرنے کے بجائے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی۔

اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو اس نے عمر کے بازو سے ہٹا لیا۔

"تم آج بھی وہیں ہو جہاں میں نے تمہیں اتنے سال پہلے دیکھا تھا۔ تم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ...... پہلے بھی تمہاری سوچ بچکانہ تھی۔ آج بھی ہے۔" وہ اندازہ نہیں کر سکی۔ وہ اسے جھڑک رہا تھا یا اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔

"تمہیں اس بات پر یقین آئے یا نہ آئے بہرحال میں نے دس سال تمہارے لیے کچھ محسوس نہیں کیا۔"

علیزہ نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"میں بہت کوشش کروں تو بھی میں اپنے اندر تمہارے لیے کوئی خاص قسم کے جذبات دریافت کرنے میں ناکام ہو جاتا ہوں۔ میں نے بارہا خود کو ٹٹولا ہے لیکن میرے دل سے کوئی آواز نہیں آئی۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے؟" اس کی سفاک حقیقت پسندی عروج پر تھی، وہی سفاکی جس کے لیے وہ مشہور تھا۔

"دس سال میں کبھی ایسا ہوا کہ میں نے تم سے اظہار محبت کیا ہو ...... ؟ نہیں میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ...... اگر دنیا میں محبت نام کا کوئی جراثیم موجود بھی ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس سے میرا دل دماغ کبھی متاثر نہیں ہوا۔"

علیزہ کے آنسو رک چکے تھے۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر اندھیرے میں اپنے سے چند انچ دور اس شخص کے ہیولے کو دیکھ رہی تھی جسے اس نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ چاہا تھا۔

"مرد اور عورت کے درمیان ہر رشتہ محبت کا رشتہ نہیں ہوتا ...... چاہو تو بھی نہیں بن سکتا ...... جیسے تمہارا اور میرا رشتہ ...... اپنے اور میرے رشتے کو اگر تم نے اتنے سالوں میں نہیں پرکھا تو یہ تمہاری غلطی ہے، میری نہیں ...... میں کسی حماقت آمیز خوش فہمی کا حصہ نہیں بن سکتا۔"

وہ ہر چیز کے چیتھڑے اڑا رہا تھا ...... اس کے اعتماد کے ...... عزت نفس کے ...... زندگی کے ...... خوابوں کے ...... خواہشات کے ...... اور علیزہ سکندر کو دس سال یہ زعم رہا تھا کہ یہ سب چیزیں اس نے اسی شخص سے لی تھیں۔

"اگر تم نے میرے حوالے سے کوئی خوش فہمیاں پال لیں تو میں کیا کر سکتا ہوں ...... میرا اس سب میں کیا حصہ ہے، درحقیقت میں اس سارے معاملے میں کبھی بھی حصہ دار نہیں رہا۔" اس نے عمر کو کندھے اچکاتے دیکھا۔

''میں تو اتنے سالوں میں سینکڑوں لڑکیوں سے ملتا رہا ہوں ...... میں سب کے ساتھ فرینڈلی رہا ہوں ...... سب کے ساتھ میرا ایک جیسا رویہ رہا ہے ...... اور میرے لیے تم بھی ان سب سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔'' وہ دم بخود تھی۔

''دوست تم تھیں ...... ہو ...... رہو گی ...... مگر اس سے دو قدم آگے بڑھ کر کسی خاص رشتے کے حوالے سے تمہیں دیکھنا بہت مشکل ہے ...... بلکہ ناممکن۔''

Rude, harsh, bitter (تند مزاجی' تلخی' سختی طبیعت) اس سے پہلے اس نے عمر کو دوسرے لوگوں کے ساتھ ان خصوصیات کا استعمال کرتے دیکھا تھا۔ آج وہ اس پر استعمال کر رہا تھا۔

''شادی کوئی ون سائیڈڈ افیئر نہیں ہوتی اور نہ ہی اسے بنانے کی کوشش کرو ...... یہ ایسا نہیں ہوتا کہ تم نے کہا اور میں نے مان لیا ...... نہ ہی یہ کوئی کیک ہوتا ہے جو میں بیکری سے بنوا کر لا دوں ...... ساری زندگی کے لیے کسی شخص کو چن کر' اس کے ساتھ رہنا بہت سوجھ بوجھ مانگتا ہے ...... صرف دماغ ہی نہیں دل بھی اس جگہ پر ہونا چاہیے جس شخص کے ساتھ جس جگہ پہ رشتہ آپ قائم کرنا چاہتے ہیں۔''

اس کی آواز میں ٹھنڈک تھی ...... وہ اس عمر سے پہلی بار ملی تھی۔

''گرینی نے مجھ سے تمہارے بارے میں بات کی ...... میں نے انکار کر دیا ...... مجھے سوچنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ It was like a reflex action...... کوئی ہچکچاہٹ ...... کوئی تامل ...... کوئی تردد ...... میں نے کچھ محسوس نہیں کیا ...... تو اس کا صاف صاف مطلب تو یہی ہے کہ جن خواتین کے بارے میں' میں نے کبھی کچھ خاص جذبات محسوس کرنے یا خاص خیالات رکھنے ... یا آسان لفظوں میں جن سے شادی کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی ...... ان میں تم کبھی نہیں آئیں ...... نہ شعوری طور پر' نہ لاشعوری طور پر۔''

علیزہ کو اب اپنے ہونٹ خشک ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

''پھر اگر صرف تمہاری ضد پر یہ یک طرفہ شادی ہو جائے تو کیا ہو گا۔ total disaster میں زندگی میں سارے حساب کتاب کر کے رسک لیتا ہوں' آنکھیں بند کر کے سوچے سمجھے بغیر کسی کھائی کو سوئمنگ پول سمجھ کر اس میں چھلانگ لگانے کا عادی نہیں ہوں ...... اور تم مجھ سے یہی سب کچھ چاہتی ہو۔''

وہ پانی پینا چاہتی تھی ...... اس کے حلق اور بدن پر کانٹوں کا جنگل اگ آیا تھا۔

''ممکن ہے' تم مجھ سے شادی کر کے خوش رہو ...... مگر سوال یہ ہے کہ کیا میں خوش رہ سکتا ہوں ...... کیا تم نے میری خوشی کا سوچا ہے؟ تم نے نہیں سوچا ہو گا ...... میں کسی شاپنگ آرکیڈ کے کسی شوکیس میں لگی ہوئی چیز نہیں ہوں جو تمہیں پسند آ جائے اور تم ہر قیمت پر اسے گھر لے جانے پر تل

اؤ۔'' اس کی آواز کے چابک اپنا کام بخوبی کر رہے تھے۔

''جہاں تک تمہاری اس غلط فہمی کا تعلق ہے کہ میں نے تمہیں اپنی زندگی سے نکال دیا ...... تو میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ نہ میں تمہیں زندگی کے اندر لایا تھا' نہ میں نے باہر نکالا ہے۔ تم س رول میں میری زندگی میں موجود ہو ...... اس رول میں ہمیشہ رہو گی ...... ہاں' مگر تم جو رول لینا پاہتی ہو' وہ میرے لیے قابل قبول نہیں ہے ...... اگر اس بات کو تم زندگی سے نکال دینا سمجھتی ہو تو بں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

اس کا دل چاہا وہ وہاں سے بھاگ جائے۔

''میں نے تمہاری زندگی تباہ کر دی ...... میں نے تمہیں معذور کر دیا ...... نہیں علیزہ! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ...... اگر یہ کسی نے کیا ہے تو تم نے خود کیا ہے۔'' اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''جہاں تک جنید کا تعلق ہے ...... اس کے ساتھ تمہاری وفاداری کا سوال ہے ...... یا تمہاری خوشی کا مسئلہ ہے تو میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں ...... سوائے اس کے کہ یہ بھی صرف اور صرف تمہارا مسئلہ ہے اور تمہیں ان دونوں چیزوں کے بارے میں منگنی سے پہلے سوچ لینا چاہیے تھا۔ تمہیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ تم اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتیں تو تمہیں اس سے منگنی کرنا ہی نہیں چاہیے تھی۔ کسی نے یقیناً تمہیں پریشرائز نہیں کیا ہو گا اس پرپوزل کے لیے کہ تم یہیں شادی کرو ...... تم نہ کرتیں۔''

وہ اسے مسئلے کا حل نہیں بتا رہا تھا' وہ اسے اس کی حماقت جتا رہا تھا۔

''بلکہ اب منگنی توڑ دو ...... اگر تمہیں یہی محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں وہ پسند نہیں ہے یا وفاداری اور خوشی کا سوال ہے تو ٹھیک ہے یہ رشتہ ختم کر دو ...... ابھی صرف منگنی ہوئی ہے اور منگنی کوئی ایسا بڑا رشتہ نہیں ہوتا جس کے بارے میں دوبارہ نہ سوچا جا سکے۔''

علیزہ کو اپنے ہاتھ پیر سن ہوتے ہوئے لگ رہے تھے۔

''لیکن اگر اس خوشی اور وفاداری کے ایشو کو تم میری ذات سے منسلک کر رہی ہو تو فارگیٹ اباؤٹ اٹ ...... مجھے ہر چیز ...... ہر تعلق ...... ہر رشتے ...... ہر بیک گراؤنڈ ...... ہر فور گراؤنڈ سے نکال کر دیکھو ...... مجھ کو بھول کر جنید کو جج کرو ...... پھر بھی تمہیں یہی لگے کہ وہ تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ تو یہ رشتہ ختم کر دو ...... مگر یہ ذہن میں ضرور رکھو کہ جنید نہیں ہو گا تو کوئی دوسرا ہو گا ...... کوئی دوسرا نہیں ہو گا تو کوئی تیسرا ہو گا ...... کوئی بھی سہی مگر ...... وہ ...... میں ...... نہیں ...... ہوں گا ...... نہ آج ...... نہ آئندہ کبھی۔''

اس نے آخری جملے کا ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا ...... ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے ...... صاف ...... واضح اور دوٹوک انداز میں ...... کسی مغالطے یا خوش فہمی کی گنجائش رکھے بغیر۔

علیزہ نے ہر لفظ سنا تھا۔ کسی دشواری ...... یا رکاوٹ کے بغیر ...... کسی خوش فہمی یا غلط فہمی کے بغیر ...... عمر کے وہاں آنے سے پہلے وہ خواہش کر رہی تھی' سب کچھ ختم ہو جائے ...... اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

بہت سے لیبلو کے ساتھ وہ آج بھی وہیں تھی' جہاں دس سال پہلے تھی ...... اندھیرے نے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کی شناخت ختم نہیں کی تھی ...... یہ کام روشنی نے کیا تھا ...... روشنی معجزے کرتی ہے ...... وجود کو اس طرح عیاں کرتی ہے کہ کسی فریب اور دھوکے میں رہنا ممکن ہی نہیں رہتا ...... مقدر کو منور کر دیتی ہے ...... ہار ماننے پر قبر میں گاڑ دیتی ہے ...... نہ ماننے پر صلیب پر چڑھا دیتی ہے ...... بس چیزوں کو ان کے مقام پر نہیں رہنے دیتی ...... پارس سے چھوئے بغیر بھی انسان سونا بن جاتا ہے اور آگ کے پاس آئے بغیر بھی موم کی طرح پگھلنے لگتا ہے ...... روشنی واقعی معجزے کرتی ہے۔

وہاں اب خاموشی تھی ...... مکمل خاموشی ...... علیزہ کبھی کسی اجنبی کے اتنا قریب نہیں بیٹھی تھی ...... آج بیٹھی تھی ...... وہ انتظار کر رہی تھی عمر کچھ اور کہے ...... کچھ اور ملامتیں ...... اور عمر شاید ان تمام باتوں کے جواب میں اس کی طرف سے کچھ کہے جانے کا منتظر تھا ...... شاید چند وضاحتیں ...... کچھ معذرتیں ...... پچھتاوے ...... اسے توقع تھی۔ علیزہ اسی طرح کا اظہار کرے گی۔ اس نے ایسا کچھ نہیں کہا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

سب کچھ اسی گھر میں شروع ہوا تھا ...... سب کچھ اسی گھر میں ختم ہو گیا تھا۔ علیزہ نے مڑ کر اوپر والی سیڑھی پر قدم رکھ دیا ...... عمر نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی ...... نہ ہی اس نے کچھ کہا۔

وہ غیر ہموار قدموں سے چلی آئی ...... اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی ...... وہ جانتی تھی۔ پیچھے رہ جانے والے شخص نے بھی اسے مڑ کر نہیں دیکھا ہوگا ...... وہ اس کا ماضی تھا ...... ایسا ماضی جس پر اس کا پچھتاوا اب شروع ہوا تھا۔

وہ اسی طرح چلتی ہوئی اندر اپنے کمرے میں آ گئی۔ شہلا سو رہی تھی۔ کمرے میں تاریکی تھی ...... وہ دبے قدموں ڈریسنگ روم میں چلی آئی۔ لائٹ جلاتے ہی سامنے قد آدم آئینے میں اس نے اپنا عکس دیکھا اور وہ چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گئی آئینے میں نمودار ہونے والا عکس کس کا تھا ...... اس نے نظریں چرا لیں ...... شکست ...... احساس جرم ...... پچھتاوا ...... ہر چیز اس کے چہرے پر تحریر تھی ...... ''بولتا ہوا چہرہ'' کوئی آواز اس کے کانوں میں لہرائی۔ اس نے آئینے کی طرف پشت کر لی ...... وہ اس وقت وہاں مزید کسی ماتم کے لیے نہیں آئی تھی ...... ماتم کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی۔

........❁........

یں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے

سین 18

وہ یہ کہہ کر بڑی لاپروائی سے اپنا بریف کیس اٹھا کر چلا گیا اور میں تب سے اسی کرسی پر جھول رہی ہوں۔ چیزوں کو بنتے ہوئے کتنے مہینے کتنے سال لگ جاتے ہیں مگر جب وہ ختم ہونے لگتی ہیں تو پھر سب کچھ لمحوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ میں کرسی پر جھولتے ہوئے سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے مرر میں اپنے وجود کو دیکھ رہی ہوں۔ مرر مجھے سبز کپڑوں میں ملبوس تراشیدہ بالوں والی ایک فربہی مائل چالیس سالہ عورت کا عکس دکھا رہا ہے جس کا ماضی ایک فریب تھا اور مستقبل ایک خواب رہا ہے۔ جس کا خوب صورت چہرہ اس مرد کے دل کو نہیں جیت پایا تھا جسے اس نے سب سے زیادہ چاہا تھا۔

''میں یہ نہیں مانتی کہ مرد کیلئے قربانی دی جائے اور وہ اسے بھول جائے۔ اس کا کوئی صلہ نہ دے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بندہ جو آپ کا شوہر ہے' آپ سے محبت کرتا ہے' آپ اس کیلئے کچھ کریں تو وہ اسے بھلا دے۔ اس کے نزدیک اس کی کوئی وقعت ہی نہ ہو اور پھر ہم دونوں میں تو ذہنی ہم آہنگی ہے۔ ہمیں تو اپنی بات ایک دوسرے تک پہنچانے کے لئے بعض دفعہ لفظوں کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ کم از کم عمر حسن وہ واحد شخص ہے جس کے بارے میں میں کہہ سکتی ہوں کہ وہ احسان فراموش نہیں ہے۔''

بہت سال پہلے ایک بار ثناء نے اپنی کسی دوست سے کہا تھا۔ اس کی آواز میرے کانوں میں لہرا رہی تھی۔ ہاں عمر حسن' احسان فراموش نہیں تھا۔ اس میں وہ خوبیاں تھیں جو عام مردوں میں نہیں تھیں اور ان خوبیوں کی وجہ سے ہی میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ مجھ میں اس جیسی کوئی خوبی نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش کی تھی۔

ہم نامکمل لوگ مکمل لوگوں کے ساتھ کبھی نہیں چل سکتے' کبھی ہمارا سانس پھول جاتا ہے اور کبھی وہ ہمیں بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

میرے ساتھ یہ دونوں باتیں ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے کسی فعل پر کوئی شرمندگی' کوئی افسوس نہیں ہے۔ میں نے جو ٹھیک سمجھا' اسے حاصل کرنے کے لئے کیا۔ میں انسان تھی کوئی فرشتہ نہیں اور

پھر سب یہی کرتے ہیں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا' اگر میری وجہ سے ثناء کو تکلیفیں اٹھانی پڑیں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ یہ سب اس کی قسمت میں تھا پھر عمر حسن مجھے ان سب چیزوں کا ذمہ دار کیسے ٹھہرا سکتا ہے۔ میں نے سترہ سال کے دوران سب کچھ پا لیا تھا۔ دولت' گھر' بچے' سکون' میں نے سوچا تھا' اب دنیا میں کچھ اور پانے اور حاصل کرنے کیلئے باقی نہیں رہا' مگر مجھے یہ پتا نہیں چلا تھا کہ عمر حسن' ہاں بس عمر حسن میرا نہیں ہوا۔ میں نے اس کو اتنا چاہا تھا کہ اس کے عشق میں اپنے وجود کو آگ بنا ڈالا تھا اور اس آگ نے کتنوں کو جلایا۔ مجھے کبھی اس کا احساس نہیں ہوا۔

اب یہاں اس کمرے میں کرسی پر جھولتے ہوئے میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔ اس سے طلاق لے لوں تو اس عمر میں اپنے چہرے' اپنے ماتھے پر یہ داغ کیسے سجا لوں۔ اپنی بیٹیوں کو میں کیا بتاؤں کہ میں عمر حسن سے طلاق کیوں لے رہی ہوں۔ اپنے ماضی کے کارنامے کو ان کے سامنے کیسے رکھ دوں۔ وہ تو پھر بہت سے سوال کریں گی میرے بارے میں' عمر حسن کے بارے میں اور ثناء کے بارے میں اور میں انہیں کوئی جواب نہیں دے سکتی اور اگر انہیں مطمئن کر بھی دوں تو ان لوگوں کو کیسے مطمئن کروں گی جو میری بیٹیوں کا رشتہ لینے آئیں گے اور اور اگر میں طلاق نہ لوں تو زندہ کیسے رہوں؟ پچھلے سترہ سال جس فریب' جس سراب کے ساتھ رہی ہوں' اس کے ساتھ آگے کیسے رہوں۔ اس کی بے اعتبار نظروں اور اجنبی لہجے کو کیسے برداشت کروں جو میرا خون کر دیتے ہیں اور یہ کیسے برداشت کروں کہ وہ اسی شہر میں ایک گھر میں اس عورت کے پاس بھی جاتا ہے جسے وہ سب سے زیادہ چاہتا ہے۔ یہ کیسے برداشت کروں کہ میرے لئے اس کی نظروں میں نفرت اور اس کے لئے محبت ہو۔ میں دوراہے پر کھڑی ہوں اور جانتی ہوں کہ منزل دونوں ہی رستوں پر نہیں ہے پھر بھی مجھے ایک رستہ چننا ہے اور میں انتخاب نہیں کر پا رہی۔

اور اب میں آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ کون سا رستہ چنوں۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے اچھا کیا یا بُرا۔ مجھ پر نیکی اور بدی کا فتویٰ جاری مت کیجئے۔ میں سب جانتی ہوں' صرف یہ نہیں جانتی کہ مجھے کیا فیصلہ کرنا چاہئے اس لئے آپ سے آپ کی مدد چاہتی ہوں۔ شاید آپ مجھے اس برزخ سے نکال لیں جس میں' میں اپنی مرضی سے گری ہوں۔ مجھے بتائیں اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟

بان اُمید اور محبت

سین 19

اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ پتا نہیں وہ سب کچھ سوچتے سوچتے رات کس وقت وئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی وہ ایک بار پھر وہیں پہنچ گئی۔ ہر چیز اتنی ہی خراب اتنی ہی بدصورت تھی جتنی ت کو تھی۔ کاش سب کچھ خواب ہوتا۔ سب کچھ۔ جہاں زیب ...... ایمان علی ...... یہ زندگی ...... ب ...... اگر ایسا ہوتا تو ابھی آنکھیں کھولنے کے بعد میں کس قدر خوش اور مطمئن ہوتی۔

اس کی آنکھوں میں چبھن ہو رہی تھی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے دونوں ہاتھوں کی لیوں سے اپنے پپوٹے چھوئے۔ سوجی ہوئی آنکھوں نے اسے ایک بار پھر یاد دلایا کہ وہ رات کو وتی رہی تھی۔ پھر ...... پھر اسے یہ بھی یاد آیا کہ اسے آج کیا کرنا ہے۔

سامنے دیوار پر لگا ہوا کلاک نو بجا رہا تھا۔ کمرے میں پھیلی ہوئی روشنی اسے بری لگ ہی تھی۔ بالکل زندگی کی طرح۔ چند منٹ وہ خالی الذہنی کی کیفیت کے ساتھ کمرے کو دیکھتی رہی۔ یواریں' کھڑکیاں' چھت' فرش' سب کچھ یہیں ہوگا' بس کچھ دیر بعد میں یہاں نہیں ہوں گی نہ ہی وبارہ کبھی آؤں گی۔ اس نے سوچا تھا۔

باہر سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں' مدھم آوازیں' چھوٹے چھوٹے قہقہے' خاموشی اور یک بار پھر آوازیں ...... اور یہ سب کچھ میں زندگی میں آخری بار سن رہی ہوں۔"

اس نے آوازوں کو پہچاننے کی کوشش کی ...... سفینہ کے قہقہے پہچاننے میں دیر نہیں لگی اس ی ہنسی بہت خوبصورت تھی کھلکھلاتی ہوئی بے اختیار ...... رواں ...... شفاف ...... معین کی بلند آواز ...... وہی مخصوص زیر و بم ...... ثاقب کا شستہ لہجہ ...... امی کی مدھم آواز ...... اس کی سماعتیں ہر آواز کو ناخت کر رہی تھیں پھر اچانک اس کی ایک ہارٹ بیٹ مس ہوئی' کوئی کرنٹ اس کی ساری حسیات یدار کر گیا۔ اس کی سماعتوں نے ان آوازوں میں ایک اور آواز کو بھی شناخت کیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ ہل نہیں سکی۔

"کیا یہ الوژن ہے یا پھر ......" اس نے ایک بار پھر اس آواز کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ "I Don`t Know" (مجھے نہیں پتا) آواز ایک بار پھر آئی اس نے کسی بات کے

جواب میں کہا تھا۔

ننگے پاؤں وہ بیڈ سے اٹھ کر بھاگتی ہوئی دروازے تک آئی اور ایک جھٹکے سے اس نے دروازہ کھول دیا۔ کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔ وہ سامنے موجود تھا۔ سب کے ساتھ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے ثاقب کی کسی بات پر مسکراتے ہوئے۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر سب دروازے کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ بھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔

''لو امید کو جگانے کا سوچ رہے تھے مگر وہ خود ہی آ گئی۔''

امی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ وہ کھلے دروازے کے درمیان کھڑی کسی بت کی طرح ایمان علی کو دیکھ رہی تھی۔

اس نے زندگی میں کبھی اپنے علاوہ کسی سے نفرت نہیں کی تھی۔ جہاں زیب سے بھی نہیں اس کا خیال تھا' نفرت صرف اپنے آپ سے ہی ہو سکتی ہے مگر اس وقت پہلی بار اسے پتا چلا کہ نفرت دوسروں سے بھی ہوتی ہے اور اس نفرت کی کوئی حد ہوتی ہے نہ حساب۔ اس وقت سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے ایمان علی سے اس نے صرف نفرت نہیں کی تھی۔ اسے گھن بھی آئی تھی۔ وہ اس پر تھوکنا بھی چاہتی تھی اور گالیاں دینا بھی۔ اس کا دل یہ بھی چاہا تھا کہ اس وقت اس کے پاس سلگتے انگارے ہوں جنہیں وہ ایمان علی پر پھینک دے یا پھر ایک ایسا بھڑکتا ہوا الاؤ ہو جس میں وہ اسے دھکیل دے ...... یا ...... یا پھر اس کے ناخن اتنے لمبے ہو جائیں جن سے وہ ایمان علی کا پورا چہرہ' پورا جسم کھرچ دے۔ اتنا گہرا اور اتنی بری طرح کہ وہ دوبارہ کبھی اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکے۔

''السلام علیکم!'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ پلکیں جھپکے بغیر اس پر نظریں جمائے چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

''امید! سلام کا جواب تو دو۔'' اس کی امی نے جیسے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''ایک مکار' دھوکے باز' ذلیل اور کمینے یہودی پر میں ...... میں اللہ کی رحمت تو نہیں بھیجوں گی۔'' اس نے زہریلے انداز میں سوچا۔

اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر ضرور تھا جس نے ایمان کو یک دم سنجیدہ کر دیا۔

''ایمان بھائی ابھی آدھ گھنٹہ پہلے آئے ہیں آپ کو لینے۔ میں انہیں بتا رہا تھا کہ آج امید بھی واپس لاہور جا رہی تھی۔ لگتا ہے' تم دونوں فون وغیرہ کے بغیر ہی کوئی وائرلیس ٹائپ کا رابطہ رکھے ہوئے ہو۔''

معین یقیناً مذاق کر رہا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر ایک جھٹکے سے پلٹ کر واپس کمرے میں آ گئی۔

''یہ ان کو کیا ہوا؟'' ثاقب نے کچھ حیران ہو کر اسے اس طرح خاموشی سے واپس جاتے دیکھ کر کہا۔

ایمان حیران نہیں ہوا۔

''وہ ناراض ہے۔ میں نے آپ کو بتایا میں کچھ عرصہ مصروفیات کی وجہ سے اس سے رابطہ نہیں کر سکا۔ فون نہ کرنے پر ہی وہ ناراض ہو کر یہاں آ گئی ہے۔ میں منا لیتا ہوں۔'' چائے کا کپ رکھتے ہوئے ایمان نے کہا اور مسکراتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اُمید نے اندر کمرے میں اس کی آواز سنی۔

''تم کیسی ہو؟'' ایمان نے اسے مخاطب کیا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

''یہ شخص میری زندگی میں کیوں آیا؟ میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ...... اپنی محبت صرف تمہارے لیے چھوڑ دی اور تم نے ...... تم نے میرے ساتھ کیا کیا۔ میری قربانی کے بدلے میں تم نے میرے مقدر میں یہ ...... یہ شخص لکھ دیا۔ ایک یہودی جس کے ساتھ میں ایک سال سے رہ رہی ہوں ...... یہ سوچتے ہوئے کہ اس نے میرے لئے اپنا مذہب چھوڑ دیا ہے۔ کیا اس سے بہتر جہاں زیب نہیں تھا۔ وہ کم از کم مسلمان تو تھا۔ اس کے ساتھ جانے پر مجھے کوڑے لگتے' سنگسار کیا جاتا مگر میرا ایمان تو رہتا ...... میرے سامنے یہ شخص تو ایمان بن کر نہ آتا۔''

اس نے بے اختیار اللہ سے شکوہ کیا تھا۔

''میں جانتا ہوں امید! تم ناراض ہو لیکن کچھ حالات ہی ایسے تھے کہ میں تم سے رابطہ نہیں کر سکا۔ آج ہی پاکستان آیا ہوں اور آتے ہی تمہیں لینے آ گیا ہوں۔''

اب اس نے قریب آ کر معذرت کی۔

اس کا دل چاہا' وہ اسے دھکے دے کر اس کمرے اور اس گھر سے نکال دے اسے چلا چلا کر بتائے کہ وہ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکی ہے مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ یہ سب کچھ کہہ سکتی ہے نہ کر سکتی ہے۔ اس کمرے سے باہر کچھ ایسے لوگ کھڑے تھے جن کے لیے اس نے ساری زندگی جدوجہد کی تھی۔ جن کے خوابوں کو تعبیر دیتے دیتے وہ اس مقام پر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اب ان لوگوں کے سامنے وہ بھکاری بن کر کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ دس سال میں دی جانے والی خوشیوں کو وہ ایک لمحے میں چھیننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ چاہتی بھی تو ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

زندگی میں بہت بار اس نے صبر اور خاموشی سے کام لیا تھا۔ اس بار اسے صبر نہیں صرف خاموشی اختیار کرنی تھی چند لمحوں کے لیے چند گھنٹوں کے لیے پھر ہمیشہ کے لیے۔ یہ یہاں نہ آتا تو بھی مجھے مرنا تھا۔ یہ یہاں آ گیا ہے تو بھی مجھے مرنا ہے مگر اب اکیلے نہیں۔ ہر شخص کو اپنے ایمان کی حفاظت خود ہی کرنی پڑتی ہے۔ مجھے بھی خود ہی کرنی ہے۔ بدلہ لینا ہے مجھے بہت سی چیزوں کا اور اس شخص کی موت یہ کام کرے گی۔ ڈینیل ایڈگر سے یہ شخص ایمان کبھی نہیں بن سکا مگر اس زندگی میں اس کی موت اسے میرا ایمان بنا دے گی۔ اس نے اس کے مسکراتے چہرے اور چمکتی آنکھوں کو

دیکھتے ہوئے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

''آئی ایم سوری۔'' وہ اب معذرت کر رہا تھا۔ ''میں دوبارہ کبھی ایسا نہیں کروں گا کہ تم سے اس طرح رابطہ ختم کر دوں۔''

''آج تمہارے ساتھ میرا ہر رابطہ ختم ہو جائے گا اور اس بار یہ کام تم نہیں میں کروں گی۔'' اس نے اس کی معذرت پر سوچا تھا۔

''کیا تم ابھی بھی ناراض ہو؟'' اس نے اب امید کے کندھوں پر ہاتھ رکھنے چاہے اور وہ جیسے ایک جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹی۔ ایمان نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ تم کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو بس ٹھیک ہے۔'' وہ اس سے دور ہٹ کر بولی تھی۔

''تم اب ناراض نہیں ہو؟''

''نہیں۔''

ایمان کچھ مطمئن ہو گیا۔ ''لاہور واپس جا کر میں تمہیں بتاؤں گا کہ میرے ساتھ امریکہ میں کیا ہوا۔ تم نے اپنا بیگ تو تیار کر لیا ہو گا۔ امی بتا رہی تھیں کہ تم بھی آج واپس جا رہی تھیں، مجھے بھی آج ہی واپس جانا ہے، کچھ ضروری کام ہے لاہور میں...... پلین میں آج مجھے سیٹیں نہیں مل سکیں اس لیے میں نے ڈیوو کی بکنگ کرائی ہے۔ ہمیں ابھی نکلنا ہو گا۔'' وہ اسے اپنا ''پروگرام'' بتا رہا تھا۔ وہ اپنا ''پروگرام'' طے کر رہی تھی۔

وہ ایک بار پھر اس کے قریب آ گیا تھا۔ اسے ایک بار پھر اس کے وجود سے اتنی ہی گھن آئی تھی۔ اس بار اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھنے کے بجائے اس نے بڑی نرمی سے اس کے دائیں گال کو اپنے ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں ایک ماہ اور چار دن کے بعد دیکھ رہا ہوں۔ کیا محسوس کر رہا ہوں بتا نہیں سکتا۔ سب کچھ بتانا بہت مشکل ہوتا ہے مگر پھر بھی تمہیں دیکھ کر مجھے بہت سکون مل رہا ہے۔ اتنا سکون کہ......''

اس نے ایک جھٹکے سے اپنے گال سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا اور پھر اس کے پاس سے ہٹ گئی۔

''مجھے تیار ہونا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔'' ایمان کا ردعمل دیکھے بغیر وہ کمرے سے نکل گئی۔

''میں بھی تمہیں ایک ماہ اور چار دن کے بعد دیکھ رہی ہوں۔ کیا محسوس کر رہی ہوں، میرے لیے بھی بتانا مشکل ہے۔ مگر پھر بھی تمہیں دیکھ کر مجھے اتنی اذیت اور بے عزتی کا احساس ہو رہا ہے کہ......'' اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے سوچا۔

پیر کامل

سین 20

اس کے اردگرد قد آدم جھاڑیاں تھیں اور شام کے ڈھلتے سایوں میں ان جھاڑیوں میں اس کی طرف کسی کا متوجہ ہو جانا کوئی معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے جسم پر اس وقت لباس کے نام پر صرف گھٹنوں سے کچھ نیچے تک لٹکنے والی برمودا شارٹس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا اور شام ہونے کے ساتھ ساتھ خنکی بڑھ رہی تھی۔ گھر میں کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ہائکنگ کے لئے یہاں آیا ہوا ہے اور جب گھر نہ پہنچنے پر اس کی تلاش شروع ہو گی تب بھی یہاں اس تاریکی میں درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان بندھے ہوئے اس کے وجود تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

آدھ گھنٹے کی جدوجہد کے بعد جب اپنے پیروں کے گرد موجود پٹیوں کو ڈھیلا کرنے اور پھر انہیں کھولنے میں کامیاب ہوا، اس وقت سورج مکمل غروب ہو چکا تھا اگر چاند نہ نکلا ہوتا تو شاید وہ اپنے ہاتھ پاؤں اور اردگرد کے ماحول کو بھی نہ دیکھ پاتا۔ اِکا دُکا گزرنے والی گاڑیوں اور لوگوں کا شور اب نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے اردگرد جھینگروں کی آوازیں گونج رہی تھیں اور وہ گردن سے کمر تک اپنی پشت پر درخت کے تنے کی وجہ سے آنے والی رگڑ اور خراشوں کو بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔ درخت کے دوسری طرف اس کے ہاتھوں کی کلائیوں میں موجود ڈوری اب اس کے گوشت میں اُتری ہوئی تھی۔ وہ ہاتھوں کو مزید حرکت دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ کلائیوں سے اُٹھتی ٹیسیں برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے منہ کے اندر موجود ٹشوز اب گل چکے تھے اور ان کے گلنے کی وجہ سے وہ منہ میں لگام کی طرح کسی ہوئی پٹی کو حرکت دینے لگا تھا مگر وہ گلے سے آواز نکالنے میں اب بھی بری طرح ناکام تھا کیونکہ وہ ان گلے ہوئے ٹشوز کو نہ نگل سکتا تھا، نہ اگل سکتا تھا۔ وہ اتنے زیادہ تھے کہ وہ انہیں چیونگم کی طرح چبانے میں بھی ناکام تھا۔

اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو رہی تھی۔ وہ صبح تک اس حالت میں وہاں یقیناً ٹھٹھر کر مرجاتا اگر خوف یا کسی زہریلے کیڑے کے کاٹنے سے نہ مرتا تو۔ اس کے جسم پر اب چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگ رہے تھے اور بار بار وہ اسے کاٹ رہے تھے۔ وہ اپنی برہنہ ٹانگوں پر چلنے اور کاٹنے والے کیڑوں کو جھٹک رہا تھا مگر باقی جسم پر رینگنے والے کیڑوں کو جھٹکنے میں ناکام تھا اور وہ نہیں جانتا

تھا کہ ان چھوٹے کیڑوں کے بعد اسے اور کن کیڑوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اگر وہاں بچھو اور سانپ ہوئے تو ......

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حالت مزید خراب ہو رہی تھی۔ ''آخر یہ سب میرے ساتھ کیوں ہوا ہے؟ آخر میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ بے چارگی سے سوچنے میں مصروف تھا۔

''اور میں یہاں مر گیا تو ......؟ تو میری تو لاش تک دوبارہ کسی کو نہیں ملے گی۔ کیڑے مکوڑے اور جانور مجھے کھا جائیں گے۔''

اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ ایک عجیب طرح کے خوف نے اسے اپنی گرفت میں لیا۔

تو کیا میں اس طرح مروں گا' یہاں ...... اس حالت میں ...... بے لباس ...... بے نشان ...... گھر والوں کو پتا تک نہیں ہوگا میرے بارے میں۔ کیا میرا انجام یہ ہونا ہے ...... اس کے دل کی دھڑکن رکنے لگی۔ اسے اپنی موت سے یک دم خوف آیا اتنا خوف کہ اسے سانس لینا مشکل لگنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے موت اس کے سامنے اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہو۔ اس کے انتظار میں۔ یہ دیکھنے کہ وہ کس طرح سسک سسک کر مرتا ہے۔

وہ درد کی پروا کیے بغیر ایک بار پھر اپنی کلائیوں کی ڈوری کو توڑنے یا ڈھیلی کرنے کی کوشش کرنے لگا' اس کے بازو شل ہونے لگے۔

پندرہ منٹ بعد اس نے ایک بار پھر اپنی جدوجہد چھوڑ دی اور اس وقت اسے احساس ہوا کہ اس کے منہ کی پٹی ڈھیلی ہو گئی تھی' وہ گردن کو ہلاتے ہوئے اسے منہ سے نکال سکتا تھا۔ اس کے بعد اس نے ٹشوز نکال دیئے تھے۔ اگلے کئی منٹ وہ گہرے سانس لیتا رہا پھر وہ بلند آواز میں اپنی مدد کے لئے آوازیں دینے لگا۔ اتنی بلند آواز میں جتنی وہ کوشش کر سکتا تھا۔

اس کا انداز بالکل ہذیانی تھا۔ آدھے گھنٹے تک مسلسل آوازیں دیتے رہنے کے بعد اس کی ہمت اور گلا دونوں جواب دے گئے۔ اس کا سانس پھول رہا تھا' یوں جیسے وہ کئی میل دوڑتا رہا ہو مگر اب بھی کوئی اس کی مدد کے لئے نہیں آیا تھا۔ کلائی کے زخم اب اس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہے تھے اور کیڑے اب اس کے چہرے اور گردن پر بھی کاٹ رہے تھے۔ وہ نہیں جانتا یک دم اسے کیا ہوا' بس وہ بلند آواز میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ زندگی میں پہلی بار بری طرح رو رہا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اسے اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا اور اس وقت درخت کے اس تنے کے ساتھ بندھے سسکتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ مرنا نہیں چاہتا ہے۔ وہ موت سے اسی طرح خوفزدہ ہو رہا تھا' جس طرح نیو ہیون میں ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا وہ کتنی دیر اسی طرح بے بسی کے عالم میں بلند آواز میں روتا رہا پھر اس کے آنسو خشک ہونے لگے۔ شاید وہ اتنا تھک چکا تھا کہ اب رونا بھی اس کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ نڈھال سا ہو کر

اس نے درخت کے تنے سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے کندھوں اور بازوؤں میں اتنا درد ہو رہا تھا کہ اسے لگ رہا تھا وہ کچھ دیر میں مفلوج ہو جائیں گے پھر وہ کبھی انہیں حرکت نہیں دے سکے گا۔

''میں نے کبھی کسی کے ساتھ اس طرح نہیں کیا پھر میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔''

اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے۔

''سالار! میرے لئے پہلے ہی بہت پرابلمز ہیں' تم اس میں اضافہ نہ کرو' میری زندگی بہت مشکل ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اور مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ کم از کم تم تو میری پچویشن کو سمجھو' میری مشکلات کو مت بڑھاؤ۔'' درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے سالار نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ نیچے بہت نیچے' بہت دور ...... اسلام آباد کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

''میں تمہارے مسائل میں اضافہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں؟ میں ......؟ مائی ڈیئر امامہ! میں تو تمہاری ہمدردی میں گھل رہا ہوں۔ تمہارے مسائل ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم خود سوچو' میرے ساتھ رہ کر تم کتنی اچھی اور محفوظ زندگی گزار سکتی ہو۔'' سالار نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔

''سالار! مجھے طلاق دے دو۔'' بھرائی ہوئی لجاجت آمیز آواز۔

''سویٹ ہارٹ! تم کورٹ میں جا کر لے لو۔ جیسا کہ تم کہہ چکی ہو۔''

وہ اب چپ چاپ خود سے بہت دور نظر آنے والی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی اس کے سامنے جیسے آئینہ لے کر کھڑا ہو گیا تھا جس میں وہ اپنا عکس دیکھ سکتا تھا اور اپنے ساتھ ساتھ کسی اور کا بھی۔

''میں نے امامہ کے ساتھ صرف مذاق کیا تھا۔'' وہ بڑبڑایا۔

''میں ...... میں اسے کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔'' اسے اپنے الفاظ کھوکھلے لگے۔

وہ پتا نہیں کس کو وضاحت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ اسی طرح اسلام آباد کی روشنیوں کو دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔

''میں مانتا ہوں' مجھ سے کچھ غلطیاں ہو گئیں۔''

اس بار اس کی آواز بھرائی ہوئی سرگوشی تھی۔ ''میں نے جانتے بوجھتے اس کے لئے مسائل کھڑے کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے دھوکا دیا مگر مجھ سے غلطی ہو گئی اور مجھے پچھتاوا بھی ہے۔ میں جانتا ہوں میرے طلاق نہ دینے سے اور جلال کے بارے میں جھوٹ بول دینے سے اسے بہت زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ مجھے واقعی پچھتاوا ہے اس سب کے لئے مگر اس کے علاوہ تو میں نے کسی اور کو کبھی دھوکہ نہیں دیا' کسی کے لئے پریشانی کھڑی نہیں کی۔''

وہ ایک بار پھر رونے لگا۔

"میرے خدا...... اگر ایک بار میں یہاں سے بچ گیا' میں یہاں سے نکل گیا تو میں امامہ کو ڈھونڈوں گا' میں اسے طلاق دے دوں گا' میں دوبارہ کبھی اسے تنگ نہیں کروں گا۔ میں جلال کے بارے میں بھی اسے سچ بتا دوں گا۔ بس ایک بار آپ مجھے یہاں سے جانے دیں۔"

وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ امامہ نے اس کے طلاق نہ دینے سے انکار پر کیا محسوس کیا ہوگا۔ شاید اسی طرح اس نے بھی اپنے ہاتھ بندھے ہوئے محسوس کیے ہوں گے جس طرح وہ کر رہا تھا۔

وہاں بیٹھے ہوئے پہلی بار وہ امامہ کی بے بسی' خوف اور تکلیف کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے جلال انصر کی شادی کے بارے میں اس سے جھوٹ بولا تھا اور اس کے جھوٹ پر امامہ کے چہرے کا تاثر اسے اب بھی یاد تھا۔ اس وقت وہ اس تاثر سے بے حد محظوظ ہوا تھا۔ وہ اسلام آباد سے لاہور تک تقریباً پوری رات روتی رہی تھی اور وہ بے حد مسرور تھا۔

وہ اس وقت اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اس اندھیری رات میں اس گاڑی میں سفر کرتے ہوئے اسے اپنے آگے اور پیچھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہوگا۔ واحد پناہ گاہ' جس کا وہ سوچ کر نکلی تھی وہ جلال انصر کا گھر تھا اور سالار سکندر نے اسے وہاں جانے نہیں دیا تھا۔ وہ رات کے اس پہر وہاں اعصاب میں اُترنے والی تاریکی میں بیٹھ کر ان اندیشوں اور خوف کا اندازہ کر سکتا تھا جو اس رات امامہ کو رلا رہے تھے۔

"مجھے افسوس ہے' مجھے واقعی افسوس ہے لیکن ...... لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر ...... اگر وہ مجھے دوبارہ ملی تو میں اس سے ایکسکیوز کر لوں گا' میں جس حد تک ممکن ہوا اس کی مدد کروں گا مگر اس وقت ...... اس وقت تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر ...... اگر میں نے کبھی ...... کبھی کوئی نیکی کی ہے تو مجھے اس کے بدلے یہاں سے رہائی دلا دے۔ او گاڈ پلیز ...... پلیز ...... پلیز۔" اس نے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اپنی نیکیاں گننے کی کوشش کی جنہیں وہ گنوا سکے۔ اس وقت پہلی بار اس پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ اس نے زندگی میں اب تک کوئی نیکی نہیں کی تھی۔ کوئی نیکی جسے وہ اس وقت اللہ کے سامنے پیش کر کے اس کے بدلے میں رہائی مانگتا۔ ایک بار پھر خوف نے اس کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی خیرات نہیں کی تھی' وہ اس پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ ہوٹلز اور ریسٹورنٹس میں ٹپ خوش دلی سے دیا کرتا تھا' مگر کبھی کسی فقیر کے ہاتھ پھیلانے پر اس نے اسے ...نہیں دیا تھا۔

اسکول کالج میں مختلف کاموں کے لئے جب فنڈ جمع ہوتے تب بھی وہ ٹکٹس خریدنے یا بیچنے سے صاف انکار کر دیتا۔

"میں چیریٹی پر یقین نہیں کرتا۔" اس کی زبان پر روکھے انداز میں صرف ایک ہی جملہ ہوتا تھا۔

"میرے پاس اتنی فالتو رقم نہیں ہے کہ میں ہر جگہ لٹاتا پھروں۔" اس کا یہ رویہ نیو ہیون میں بھی جاری رہا تھا۔ یہ سب صرف چیریٹی تک ہی محدود نہیں تھا۔ وہ چیریٹی کے علاوہ بھی کسی کی مدد کرنے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اسے کوئی ایسا لمحہ یاد نہیں آیا' جب اس نے کسی کی مدد کی ہو' صرف امامہ کی مدد کی تھی اور اس مدد کے بعد اس نے جو کچھ کیا تھا اس کے بعد وہ اسے نیکی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ عبادت کرنے کا بھی عادی نہیں تھا۔ شاید بچپن میں اس نے چند بار سکندر کے ساتھ عید کی نماز پڑھی ہو مگر وہ بھی عبادت سے زیادہ ایک رسم تھی۔ اسے نیو ہیون میں وہ رات یاد آئی جب وہ عشاء کی نماز ادھوری چھوڑ کر بھاگ آیا تھا اور اس کے ساتھ اسے اس hooker کو دیئے ہوئے 50 ڈالر بھی یاد آئے۔ شاید وہ واحد موقع تھا جب اسے کسی پر ترس آیا تھا۔ وہ مستقل اپنے ذہن کو اپنی کسی نیکی کی تلاش میں کھنگالتا رہا مگر ناکام رہا۔

اور پھر اسے اپنے گناہ یاد آنے لگے۔ کیا تھا جو وہ نہیں کر چکا تھا۔ اس کے آنسو' گڑگڑانا' رونا سب کچھ یک دم ختم ہو گیا۔ حساب کتاب بالکل صاف تھا۔ وہ اگر آج اس حالت میں مر جاتا تو اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہوتی۔ بائیس سال کی عمر میں وہاں بیٹھے کئی گھنٹے صرف کرنے پر بھی جس شخص کو اپنی کوئی نیکی یاد نہ آئے جبکہ اس شخص کا آئی کیو لیول 150+ ہو اور اس کی میموری فوٹو گرافک ...... وہ شخص اللہ سے یہ چاہتا ہو کہ اسے اس کی کسی نیکی کے بدلے اس آزمائش سے رہا کر دیا جائے جس میں وہ پھنس گیا ہے۔

"What is next to ecstasy?"

اس نے ٹین ایج میں کوکین پیتے ہوئے ایک بار اپنے دوست سے پوچھا تھا' وہ بھی کوکین لے رہا تھا۔

"more ecstasy"۔ اس نے کہا تھا۔ اس نے کوکین لیتے ہوئے اسے دیکھا۔

There is no end to ecstasy. It is preceded by pleasure and followed by more ecstasy.

وہ نشے کی حالت میں اس سے کہہ رہا تھا۔ سالار مطمئن نہیں ہوا۔

No, it does end. What happens when it ends? When it really ends?

اس کے دوست نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

You know it yourself, don`t you? you have been through it off and on.

سالار جواب دینے کے بجائے دوبارہ کوکین لینے لگا تھا۔

اس کی کلائیوں کے گوشت میں اترتی ڈوری اسے اب جواب دے رہی تھی۔ "pain"

(درد)۔

"What is next to pain?"۔

اس نے مضحکہ خیز لہجے میں اس رات امامہ ہاشم سے پوچھا تھا۔

"Nothingness"۔

رسی نما کوئی چیز لہراتے ہوئے اس کے جسم پر گری تھی۔ اس کے سر' چہرے' گردن' سینے پیٹ ...... اور وہاں سے تیز رفتاری سے رینگتی ہوئی اُتر گئی۔

سالار نے کانپتے جسم کے ساتھ اپنی چیخ روکی تھی۔ وہ کوئی سانپ تھا جو اسے کاٹے بغیر چلا گیا تھا۔ اس کا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ اس کا جسم اب جاڑے کے مریض کی طرح تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"Nothingness" آواز بالکل صاف تھی۔

"And what is next to nothingness?"۔

تحقیر آمیز آواز اور مسکراہٹ اس کی تھی۔

"Hell"۔

اس نے یہی کہا تھا۔ پچھلے آٹھ گھنٹے سے وہاں بندھا ہوا تھا اس ویرانے' اس تاریکی' اس وحشت ناک تنہائی میں۔ وہ پورا ایک گھنٹہ حلق کے بل پوری قوت سے مدد کے لئے پکارتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا حلق آواز نکالنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

Nothingness سے Hell وہ ان دونوں کے بیچ کہیں معلق تھا یا شاید Nothingness میں داخل ہونے والا تھا اور Hell تک پہنچنے والا تھا۔

"تمہیں خوف نہیں آتا یہ پوچھتے ہوئے کہ Hell کے بعد آگے کیا آئے گا؟ دوزخ کے بعد آگے کیا آ سکتا ہے؟ انسان کے معتوب اور مغضوب ہو جانے کے بعد باقی بچتا ہی کیا ہے جسے جاننے کا تمہیں اشتیاق ہے؟"

سالار نے وحشت بھری نظروں سے اردگرد دیکھا۔ وہ کیا تھا' قبر یا دوزخ یا زندگی میں اس کا ایک منظر ...... بھوک' پیاس' بے بسی' بے یاری و مددگاری' جسم پر چلتے کیڑے جنہیں وہ خود کو کاٹنے سے روک تک نہیں پا رہا تھا۔ مفلوج ہوتے ہوئے ہاتھ پاؤں' پشت اور ہاتھوں کی کلائیوں پر لحہ بہ لحہ بڑھتے ہوئے زخم ...... خوف تھا یا دہشت' پتا نہیں کیا تھا مگر وہ بلند آواز میں پاگلوں کی طرح چیخیں مارنے لگا تھا۔ اس کی چیخیں دور دور تک فضا میں گونج رہی تھیں۔ ہذیانی اور جنونی انداز میں بلند کی جانے والی بے مقصد اور خوفناک چیخیں۔ اس نے زندگی میں اس طرح کا خوف کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔ اسے اپنے اردگرد عجیب سے بھوت چلتے پھرتے نظر آنے لگے تھے۔

اسے لگ رہا تھا اس کے دماغ کی رگ پھٹنے والی ہے یا پھر نروس بریک ڈاؤن' پھر اس کی چیخیں آہستہ آہستہ دم توڑتی گئیں۔ اس کا گلا پھر بند ہو گیا تھا۔ اب صرف سرسراہٹیں تھیں جو

اسے سنائی دے رہی تھیں۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ اب مر رہا ہے۔ اس کا ہارٹ فیل ہو رہا ہے یا پھر وہ اپنا ذہنی توازن کھو دینے والا ہے اور اسی وقت اچانک تنے کے پیچھے بندھی ہوئی کلائیوں کی ڈوری ڈھیلی ہ گئی۔ ہوش وحواس کھوتے ہوئے اس کے اعصاب نے ایک بار پھر جھٹکا لیا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ ڈوری اور ڈھیلی ہوتی گئی۔ شاید مسلسل تنے کی رگڑ لگتے لگتے درمیان سے ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے ہاتھوں کو کچھ اور حرکت دی اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ درخت کے تنے سے آزاد ہو چکا تھا۔

اس نے بے یقینی کے عالم میں اپنے بازوؤں کو سیدھا کیا۔ درد کی تیز لہریں اس کے بازوؤں سے گزریں۔

"کیا میں' بچ گیا ہوں؟"

اس نے بے یقینی سے اندھیرے میں اپنے بازوؤں اور ہاتھوں کے ہیولے دیکھے ہوئے سوچا۔

"کیوں؟ کس لئے؟" ماؤف ہوتے ہوئے ذہن کے ساتھ اس نے اپنی گردن کے گرد موجود اس پٹی کو اُتارا جو پہلے اس کے منہ کے گرد باندھی گئی تھی' بازوؤں کو دی گئی معمولی حرکت سے اس کے منہ سے کراہ نکلی تھی۔ اس کے بازوؤں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ اتنی تکلیف کہ اسے لگ رہا تھا وہ دوبارہ کبھی اپنے بازو استعمال نہیں کر سکے گا۔ اس کی ٹانگیں بھی سن ہو رہی تھیں۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ وہ لڑکھڑا کر بازوؤں کے بل زمین پر گرا۔ ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ اس نے دوسری کوشش ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کی۔ اس بار وہ کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ دونوں لڑکے اس کے جاگرز اور گھڑی بھی لے جا چکے تھے۔ اس کی جرابیں وہیں کہیں پڑی تھیں۔ وہ اندھیرے میں انہیں ٹٹول کر پہن سکتا تھا مگر بازوؤں اور ہاتھوں کو استعمال میں لانا پڑتا اور وہ اس وقت یہ کام کرنے کے قابل نہیں تھا نہ جسمانی طور پر' نہ ذہنی طور پر۔

وہ اس وقت صرف وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ہر قیمت پر' اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا۔ جھاڑیوں سے الجھتا خراشیں لیتا وہ کسی نہ کسی طرح اس راستے پر آ گیا تھا جس راستے سے وہ دونوں ہٹا کر اسے وہاں لے آئے تھے اور پھر ننگے پاؤں اس نے نیچے کا سفر طے کیا۔ اس کے پیروں میں پتھر اور کنکریاں چبھ رہی تھیں مگر وہ جس ذہنی اور جسمانی اذیت کا شکار تھا اس کے سامنے یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کیا وقت ہوا تھا مگر اسے یہ اندازہ تھا کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ اسے نیچے آنے میں کتنا وقت لگا اور اس نے یہ سفر کس طرح طے کیا۔ وہ نہیں جانتا ...... اسے صرف یہ یاد تھا کہ وہ پورے راستہ بلند آواز سے روتا رہا تھا۔

......❖......

مر بیل

سین 21

''مجھے عمر سے صرف ایک شکایت تھی۔'' اس نے جوڈتھ کو کہتے سنا۔ وہ بیڈ پر پاؤں اوپر
یے بیٹھی ہوئی تھی۔علیزہ جاتے جاتے رک گئی۔ جوڈتھ کی آنکھیں متورم تھیں۔ وہ اس وقت جیسے کسی
رانس میں آئی ہوئی تھی۔

''اس نے میرا خیال رکھا ...... اس نے میری پروا کی۔ اس نے میری خواہشات کا
احترام کیا۔اس نے میرے ساتھ ہر چیز شیئر کی۔بس اس نے مجھ سے محبت نہیں کی۔''

علیزہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔ جوڈتھ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''محبت ......اس نے تم سے کی۔'' وہ اب تھکے ہوئے انداز میں مسکرا رہی تھی۔

''تمہاری منگنی والی رات میں اسلام آباد میں تھی۔ اس نے مجھے رات دو بجے فون کیا۔
وہ بہت زیادہ ڈپریس تھا مجھے بہت حیرانی ہوئی۔ کم از کم اس رات اسے ڈپریس نہیں ہونا چاہیے
تھا۔ اس رات تمہاری اور جنید کی منگنی تھی۔ اسے بہت خوش ہونا چاہیے تھا ...... میں نے اس سے یہ
کہہ دیا۔ وہ بہت دیر خاموش رہا۔ اتنی دیر کہ مجھے لگا' فون ڈس کنکٹ ہو گیا ہے۔ پھر اس نے مجھ
سے کہا۔

''میں نے آج اس کو بہت رُلایا ہے۔ بہت زیادہ' میں نے آج اس کو بہت جھڑکا ہے' وہ
مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے' وہ جنید کے ساتھ منگنی توڑنا چاہتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ میرے بغیر
زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں نے آج اسے بہت جھڑکا ہے۔ اسے بہت رلایا ہے۔لیکن میں اس کے پاس
سے اٹھ کر آیا ہوں تو مجھے لگ رہا ہے۔ میں تو اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ مجھے تو اس سے
بہت محبت ہے۔ میں کیسے اسے جنید کے ساتھ دیکھ سکوں گا۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔''

اس نے' اس رات میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ میں تو تب تک یہی
سمجھتی رہی تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔لیکن وہ ...... میں اگلے دن لاہور چلی آئی۔ میں نے اس
سے کہا۔

''تم علیزہ کی بات مان لو' اگر تم اس سے محبت کرتے ہو تو اس سے شادی کر لو۔'' اس

نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ پچھلی رات شراب پی رہا تھا' شائید شراب کے نشے میں اس نے
کوئی فضول بات کی ہو گی۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔مگر میں جان گئی تھی۔ وہ مجھ سے محبت نہیں
کرتا تھا یا شاید ویسی محبت نہیں کرتا تھا جیسی تم سے کرتا تھا۔''

علیزہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ زرد چہرے کے ساتھ' پھر اس نے مڑ کر کمرے پر
ایک نظر ڈالی۔

وہ وہیں کہیں تھا۔ اس کی راکنگ چیئر اسی طرح جھولتی محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ جھلایا
کرتا تھا' ہر چیز پر جیسے اس کا لمس موجود تھا' ہر طرف جیسے اس کی آواز گونج رہی تھی۔ وہی دھیما ٹھہرا'
گہرا لہجہ' وہی پرسکون' دل کے کہیں اندر تک اُتر جانے والی آواز ......'' ''علیز ے۔'' اور پھر وہی
کھلکھلاتے ہوئے بے اختیار قہقہے۔ اس کمرے میں سب کچھ زندہ تھا۔ واہمہ عکس بن گیا تھا۔ اور
عکس حقیقت بن کر اس کے اردگرد پھرنے لگا تھا۔

اس نے مڑ کر ڈریسنگ ٹیبل کو دیکھا۔ جوڈتھ شاید اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے چلی آئی۔ ایک سایہ اس کے ذہن میں لہرایا'
ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں یک دم کوئی نظر آنے لگا۔ اسے اپنی گردن پر' بالوں پر ایک پھواری پڑتی
ہوئی محسوس ہوئی۔

''میں علیزہ کو Joy دوں گا۔ پھر Eternity۔''

اس نے مڑ کر جوڈتھ کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

وہ کچھ دیر جوڈتھ کو دیکھتی رہی۔ پھر لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھول کر
باہر چلی گئی۔

......❀......

پیرِ کامل

سین 22

"تمہیں پتا ہے امامہ! نو سال میں کتنے دن' کتنے گھنٹے' کتنے منٹ ہوتے ہیں؟"

خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی آواز میں جسم کو چٹخا دینے والی ٹھنڈک تھی۔ امامہ نے ہونٹ بھینچتے ہوئے نل بند کر دیا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اتنا قریب کہ وہ اگر مڑنے کی کوشش کرتی تو اس کا کندھا ضرور اس کے سینے سے ٹکرا جاتا۔ اس نے مڑنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ اپنی گردن کی پشت پر اس کے سانس لینے کی مدھم آواز سن سکتی تھی۔ وہ اب اس کے جواب کا منتظر تھا۔ اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ سنک کے کناروں پر ہاتھ جمائے وہ نل سے گرتے ہوئے چند آخری قطروں کو دیکھتی رہی۔

"کیا ان سالوں میں ایک بار بھی تم نے میرے بارے میں سوچا؟ سالار کے بارے میں؟"

اس کے سوال مشکل ہوتے جا رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر چپ رہی۔

"What is next to ecstasy?" وہ جواب کا انتظار کئے بغیر کہہ رہا تھا۔

"تم نے کہا تھا pain تم نے ٹھیک کہا تھا It was pain۔"

وہ ایک لمحہ کے لئے رُکا۔

"میں یہاں اس گھر میں ہر جگہ تمہیں اتنی بار دیکھ چکا ہوں کہ اب تم میرے سامنے ہو تو مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

امامہ نے سنک کے کناروں کو اور مضبوطی سے تھام لیا۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو روکنے کے لئے وہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

"مجھے لگتا ہے' میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ آنکھیں کھولوں گا تو ......"

وہ رکا۔ امامہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

"تو سب کچھ ہو گا' بس تم نہیں ہو گی۔ آنکھیں بند کروں گا تو......"

امامہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے گال بھیگ رہے تھے۔

"تو بھی اس خواب میں دوبارہ نہیں جا پاؤں گا۔ تم وہاں بھی نہیں ہو گی' مجھے تمہیں ہاتھ لگاتے ڈر لگتا ہے۔ ہاتھ بڑھاؤں گا تو سب کچھ تحلیل ہو جائے گا جیسے پانی میں نظر آنے والا عکس۔"

وہ اس کے اتنے قریب تھا کہ ذرا جھکتا تو اس کے ہونٹ اس کے بالوں کو چھو جاتے مگر وہ اسے چھونا نہیں چاہتا تھا۔

"اور تم ہو کون امامہ......؟ آمنہ......؟ میرا وہم......؟ یا پھر کوئی معجزہ؟"

"کیا میں تمہیں یہ بتاؤں کہ مجھے...... مجھے تم سے......"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ امامہ کی آنکھوں سے نکلنے والا پانی اس کے چہرے کو بھگوتا ہوا اس کی ٹھوڑی سے ٹپک رہا تھا۔ وہ کیوں رکا تھا' وہ نہیں جانتی تھی مگر اسے زندگی میں کبھی خاموشی اتنی بُری نہیں لگی تھی جتنی اس وقت لگی تھی۔ وہ بہت دیر خاموش رہا۔ اتنی دیر کہ وہ اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی اور تب اسے پتا چلا وہ کیوں خاموش ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ بھی بھیگا ہوا تھا۔

وہ دونوں زندگی میں پہلی بار ایک دوسرے کو اتنے قریب سے دیکھ رہے تھے۔ اتنے قریب سے کہ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں نظر آنے والے اپنے اپنے عکس کو بھی دیکھ سکتے تھے پھر سالار نے اس سے نظریں چرانے کی کوشش کی تھی۔

وہ اپنے ہاتھ سے اپنے چہرے کو صاف کر رہا تھا۔

"تم مجھ سے اور میں تم سے کیا چھپائیں گے سالار......! سب کچھ تو جانتے ہیں ہم ایک دوسرے کے بارے میں......"

امامہ نے مدھم آواز میں کہا۔ سالار نے ہاتھ روک کر سر اٹھایا۔

"میں کچھ نہیں چھپا رہا۔ میں آنسوؤں کو صاف کر رہا ہوں تا کہ تمہیں اچھی طرح دیکھ سکوں۔ تم پھر کسی دھند میں لپٹی ہوئی نظر نہ آؤ۔"

وہ اس کے کان کی لو میں لٹکنے والے اُن موتیوں کو دیکھ رہا تھا' جنہیں اس نے بہت سال پہلے بھی دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا آج وہ بہت قریب تھے۔ ایک بار اُن موتیوں نے اسے بہت رلایا بھی تھا۔ وہ موتی آج بھی رلا رہے تھے' اپنے ہر ہلکورے کے ساتھ' وہم سے جنبش...... جنبش سے وہم بنتے ہوئے۔

وہ اپنے کانوں کی لوؤں پر اس کی محویت محسوس کر رہی تھی۔

"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں کبھی تمہارے اتنے قریب کھڑے ہو کر تم سے بات کر رہا ہوں گا۔"

وہ مسکرایا تھا لیکن نم آنکھوں کے ساتھ...... امامہ نے اس کے دائیں گال میں چند لمحوں کے لئے اُبھرنے والا گڑھا دیکھا۔ مسکراتے ہوئے اس کے صرف ایک گال میں ڈمپل پڑتا تھا'

دائیں گال میں اور نو سال پہلے امامہ کو اس ڈمپل سے بھی بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ نو سال کے بعد اس ڈمپل نے پہلی بار عجیب سے انداز میں اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔

"میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میں کبھی تمہارے کان میں موجود ایئر رنگ کو ہاتھ لگاؤں گا اور تم ......"

وہ اب اس کے دائیں کان میں ہلکورے لیتے ہوئے موتی کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے روک رہا تھا۔

"اور تم ...... تم مجھے ایک تھپڑ نہیں کھینچ مارو گی۔"

امامہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ سالار کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اگلے لمحے وہ گیلے چہرے کے ساتھ بے اختیار ہنسی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

"تمہیں ابھی بھی وہ تھپڑ یاد ہے۔ وہ ایک reflex action تھا اور کچھ نہیں۔"

امامہ نے ہاتھ کی پشت سے اپنے بھیگے ہوئے گالوں کو صاف کیا۔ وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ ڈمپل ایک بار پھر نمودار ہوا۔ اس نے بہت آہستگی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے ہاتھ تھام لئے۔

"تم جاننا چاہتے ہو کہ میں اتنے سال کہاں رہی' کیا کرتی رہی' میرے بارے میں سب کچھ؟"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ رہا تھا۔

"میں کچھ جاننا نہیں چاہتا' کچھ بھی نہیں۔ تمہارے لئے اب میرے پاس کوئی اور سوال نہیں ہے۔ میرے لئے کافی ہے کہ تم میرے سامنے کھڑی ہو' میرے سامنے تو ہو۔ میرے جیسا آدمی کسی سے کیا تحقیق کرے گا۔"

امامہ کے ہاتھ سالار کے سینے پر اس کے ہاتھوں کے نیچے دبے تھے۔ پانی نے اس کے ہاتھوں کو سرد کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ کیوں اس کے ہاتھ اپنے سینے پر رکھے ہوئے تھا۔ لاشعوری طور پر وہ اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی بڑا کسی بچے کے سرد ہاتھوں میں حرارت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کے سینے پر ہاتھ رکھے وہ سویٹر کے نیچے سے اس کے دل کی دھڑکن کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ بے ترتیب تھی۔ تیز ...... پر جوش ...... کچھ کہتی ہوئی ...... کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہوئی ...... اس کے سینے پر ہاتھ رکھے وہ اس وقت اس کے دل تک پہنچی ہوئی تھی' اسے شبہ نہیں تھا۔

وہ شخص اس سے محبت کرتا تھا' کیوں کرتا تھا؟ اس کا جواب سامنے کھڑا ہوا شخص بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے اس شخص سے یہ سوال کیا بھی نہیں تھا۔ سالار کی آنکھیں پرسکون انداز میں

بند تھیں نہ بھی ہوتیں تب بھی ان آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اب اسے کوئی الجھن نہیں ہو رہی تھی۔ ان آنکھوں میں جو کچھ نو سال پہلے تھا اب نہیں تھا۔ جواب تھا وہ نو سال پہلے نہیں تھا۔

"ہم کیا ہیں' ہماری محبتیں کیا ہیں' کیا چاہتے ہیں' کیا پاتے ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی اُترنے لگی تھی۔

"جلال انصر ...... اور سالار سکندر ...... خواب سے حقیقت ...... اور حقیقت سے خواب ...... زندگی کیا اس کے سوا اور کچھ ہے؟"

امامہ نے آہستگی سے اپنے ہاتھ کھینچے۔ سالار نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک ثانیے کے لئے اُبھرنے والے تاثر کو صرف وہی پہچان سکتی تھی

پریشانی' اضطراب' خوف ...... تینوں میں سے کچھ تھا۔ امامہ نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا پھر سیاہ سویٹر کے گلے سے باہر نکلے ہوئے سفید کالرز کو دیکھا۔ کچھ کہے بغیر بہت نرمی کے ساتھ اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے اس نے سالار کے سینے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے پہلی بار سالار کے کولون کی ہلکی سی مہک کو محسوس کیا۔ نو سال پہلے وہ بہت تیز قسم کے پرفیومز استعمال کرتا تھا۔ نو سال بعد ......؟

سالار بالکل ساکت تھا۔ یوں جیسے اسے یقین نہیں آیا ہو۔ چند لمحوں کے بعد اس نے بڑی نرمی کے ساتھ امامہ کے گرد اپنے بازو پھیلائے۔

"I am honoured" (یہ میرے لئے اعزاز ہے)۔

امامہ نے اسے مدھم آواز میں کہتے سنا۔ وہ اس کی بند آنکھوں کو نرمی سے چوم رہا تھا۔

دربارِ دل

سین 23

"تمھارے پریکٹیکل جوکس کا اب کیا حال ہے؟" مونس نے کھانے کی میز پر مراد سے پوچھا۔

"شادی کر لی اس سے بڑا پریکٹیکل جوک کیا ہو سکتا ہے؟" مراد نے اسی انداز میں جواب دیا۔

"بھابھی کو پتہ ہے تمھارے چکروں کا۔" مونس نے اچانک بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہاں یار سب پتہ ہے...... اپنی ساری گرل فرینڈز کے بارے میں بتا چکا ہوں اسے۔" مراد نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ مونس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

"واقعی بھابھی؟" میں نے جواب نہیں دیا صرف مسکرا دی۔

"اور تمھارے پریکٹیکل جوکس...... ان کے بارے میں بتایا ہے بھابھی کو۔"

"ان کے بارے میں تم بتا دو...... تم کس لیے آئے ہو؟" مراد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں چپ چاپ ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی مجھے نہ مراد کے افیئرز میں دلچسپی تھی نہ اس کے پریکٹیکل جوکس میں...... مگر میں ہمیشہ کی طرح چپ چاپ ایک مسکراہٹ کے ساتھ ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

"وہ ایکسیڈنٹ والا کارنامہ سنایا تھا اپنا؟" مونس اب مراد سے کہہ رہا تھا۔

"کون سا ایکسیڈنٹ والا؟" مراد نے ماتھے پر چند بلوں کے ساتھ پوچھا۔ "Don't tell me...... کہ تمھیں اپنا Canada جانے سے پہلے آخری کارنامہ بھول گیا ہو۔" مونس نے کچھ تنبیہی انداز میں کہا۔ مراد نے یک دم قہقہہ لگایا۔

"My God...... تم کو بھی کیا یاد آ گیا...... وہ Fake accident...... Good gracious۔" مراد نے اپنی پلیٹ میں چکن کا ایک اور ٹکڑا رکھتے ہوئے کہا۔

"بھابھی مراد کو ہمیشہ الٹرا ماڈرن لڑکیاں اچھی لگتی تھیں...... اسے پردہ کرنے والی لڑکیوں سے بڑی چڑ ہوتی تھی۔" مونس اب مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"چڑ؟...... مجھے ان سے نفرت تھی...... اور مجھے جتنی نفرت تھی مونس صاحب کو اتنی ہی

ہمدردی تھی ان سے۔" مراد نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ایک دن میں رات کے وقت مونس کے گھر سے کوئی کال کرنے لگا کہ لائن کراس ہو گئی۔ دو لڑکیاں فون پر بات کر رہی تھیں ایک لڑکی لبرل تھی اور دوسری کچھ زیادہ ہی دین دار بن رہی تھی۔ وہ پہلی لڑکی کو بڑی نصیحتیں کر رہی تھی۔

"مراد کے لہجے میں تضحیک اور تحقیر تھی۔" بوائے فرینڈ بنانا غلط ہے یہ غلط ہے وہ غلط ہے۔ میں اور مونس کافی دیر ان کی باتیں سنتے رہے۔ مونس بڑا متاثر ہوا تھا اس دوسری لڑکی کی باتوں سے۔ مراد نے چھیڑنے والے انداز میں مونس سے کہا۔

"نہیں بھابھی یہ بات نہیں تھی۔ وہ لڑکی باتیں ٹھیک کر رہی تھی اور جو کچھ وہ دوسری لڑکی کو سمجھا رہی تھی وہ بھی ٹھیک......" مراد نے مونس کی بات مذاق اڑانے والے انداز میں کاٹی۔

"میں نے تمھیں بتایا تھا نا کہ اس زمانے میں مونس کو ایسی لڑکیوں سے بڑی عقیدت ہوا کرتی تھی...... فون تو ہم نے بند کر دیا مگر ان دونوں لڑکیوں کے حوالے سے ہم دو تین گھنٹے بحث کرتے رہے...... اب یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اگلے کچھ دن میں مونس کے گھر جاتا رہا اور اس مخصوص وقت پر جب بھی کال کرتا فون کی لائن کراس ہوتی اور اس وقت وہی دونوں لڑکیاں بات کر رہی ہوتیں...... میں تو تنگ آ گیا اس کی نصیحتیں سن سن کر...... مجھے یوں لگتا تھا جیسے دنیا میں وہی ایک پارسا ہو اور اس کا نزول ابھی کچھ دن پہلے ہی جنت سے ہوا ہو۔" مونس مراد کی بات پر ہنس پڑا۔

"میں نے ایک دن مونس سے شرط لگائی کہ یہ لڑکی جو دوسروں کو بڑی نصیحتیں کرتی پھر رہی ہے...... اسے خود موقع ملے تو یہ دوسری لڑکی سے بھی بڑھ کر کارنامے کرے گی۔" خوف کی ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سے گزری تھی۔ مجھے صوبیہ اور اپنی گفتگو یاد آنے لگی تھی۔ فون...... وقت...... دو لڑکیاں...... بوائے فرینڈ...... نصیحتیں...... لبرل...... دین دار...... میں پلکیں جھپکائے بغیر مراد کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں لڑکیاں ہم نہیں ہو سکتی تھیں۔

"آپ کے شوہر کا ذہن شیطانی ذہن ہے بھابھی۔" مونس نے مجھ سے کہا۔

"ہاں اور تُو تو بڑا فرشتہ ہے۔" مراد نے کہا۔ میں بے حس و حرکت ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ہنستے، گپیں لگاتے، کھانا کھاتے ہوئے اس قصے کو دہرا رہے تھے۔

"500 کی شرط لگائی تھی میں نے مونس کے ساتھ کہ میں تمھیں اس لڑکی کو ٹریپ کر کے دکھاتا ہوں۔"

"اور میں نے کہا نہیں 1000 کی شرط لگاؤ کیونکہ مجھے یقین تھا یہ شرط ہار جائے گا وہ لڑکی اپنی باتوں سے اتنے مضبوط کردار کی لگتی تھی۔" مونس کہہ رہا تھا۔

"اور میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ اگر اس بار یہ اس لڑکی کے ساتھ فلرٹ کرنے میں

کامیاب نہیں ہوا تو پھر یہ آئندہ پردہ کرنے والی لڑکیوں کے بارے میں اپنی بکواس بند کر دے گا۔“

”ایمانداری کی بات ہے مہر کہ اگر میں اس لڑکی کو ٹریپ کرنے میں ناکام رہتا تو میں واقعی ان لڑکیوں کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس لڑکی سے شادی ہی کر لیتا اس کے باوجود کہ اس زمانے میں۔“ مونس نے اس کی بات کاٹی۔

”ہر زمانے میں۔“

”او کے ہر زمانے میں مجھے الٹرا ماڈرن لڑکیاں پسند تھیں لیکن وہ لڑکی اگر واقعی اتنے اچھے کردار کی ہوتی جتنی وہ اپنی باتوں سے ظاہر ہوتی تھی تو میں ضرور......“ مونس نے ایک بار پھر مراد کی بات کاٹ دی۔

”ہمارے ایک دوست کا باپ ایکسچینج میں تھا مراد نے اس کے ذریعہ میرے فون کو چیک کروا کر دونوں نمبروں کو ٹریس کروا لیا...... اور پھر یہ اس لڑکی کو فون کرنے لگا...... کیا نام تھا مراد اس لڑکی کا؟“ مونس مراد سے پوچھ رہا تھا۔

”اس لڑکی کا نام...... اس کا نام......“ مراد ہاتھ روک کر سوچنے لگا۔

”ہاں می می نام تھا۔“ میرے کانوں میں ایک دھماکہ ہوا تھا یا پھر پگھلا ہوا سیسہ تھا جو اتارا جا رہا تھا...... سامنے بیٹھا ہوا مرد کون تھا؟...... کیا کہہ رہا تھا؟...... کیوں کہہ رہا تھا؟

”میں نے اسے اپنا نام موی بتایا تھا یہ مونس کا نِک نیم تھا...... می می اور موی زبردست Combination بن گیا تھا۔“ مراد ہنس رہا تھا......

”وہ لڑکی چند بار کی گفتگو کے بعد ہی مجھے شادی پر مجبور کرنے لگی۔ تب میں نے پلان کیا کہ اس کو کہیں باہر بلواتے ہیں اور ہم دونوں اسے شرمندہ کریں گے۔ مگر وہ ملنے پر کسی طرح رضا مند نہیں ہو رہی تھی۔ پھر میں نے ایک دن موبائل پر فون کر کے اس پر یوں ظاہر کیا جیسے میں اپنے بائیک سے گر گیا ہوں اور شدید زخمی ہوں...... میں نے اس کو مدد کے لیے آوازیں دیں...... مگر وہ لڑکی آئی نہیں پھر بھی شرط میں جیت گیا تھا مونس بے چارہ تو اس کے بعد مجھ سے نظر نہیں ملا سکا۔“

”تو نے دوبارہ کبھی اس لڑکی کو فون کیا؟“ ”نہیں یار اس کے ایک ہفتہ بعد تو میں Canada چلا گیا تھا اور ویسے بھی میں بور ہو گیا تھا اس سارے تماشے سے......“

”کیا ہوا مہر؟...... کھانا کیوں چھوڑ دیا؟“ مراد نے پہلی بار مجھ پر غور کیا تھا اور میں نے بھی پہلی بار ہی مراد کو دیکھا تھا...... یا موی کو دیکھا تھا...... اس کی آواز جسے میں Illusion سمجھتی رہی...... وہ آواز چار سال کے بعد ایک چہرہ بن کر میرے سامنے آ گئی تھی۔

سانوں قبلہ تے کعبہ سوہنا یار دسیندا
سانوں قبلہ تے کعبہ سوہنا یار دسیندا

میں چار سال کے بعد اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس کے لیے میں عشق حقیقی سے عشق

مجازی پر آئی تھی۔

تیرے عشق نے ڈیرا میرے اندر کیتا
بھر کے زہر پیالہ میں تاں آپے پیتا

میں نے جس آدمی کے لیے چار سال میں ”روح“ کو ”جسم“ بنا ڈالا تھا وہ میری پارسائی کو 1000 روپے کے لیے جانچ رہا تھا......

کوئی طلسم تھا جو ٹوٹا تھا مگر کہاں ٹوٹا تھا۔ ”اور انسان شر کو اس طرح مانگتا ہے جیسے خیر کو اور بے شک انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔“

میرے ہاتھ سے کانٹا چھوٹ کر پلیٹ میں گرا۔ پھر چھری...... میرے ہاتھوں کی گرفت سے باقی سب کچھ چار سال پہلے چھوٹ گیا تھا۔ جس مرد کے لیے میں سب کچھ چھوڑے بیٹھی تھی اس کے لیے می می کیا تھی...... کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں...... اسے اس کا نام بھی بہت سوچ کر یاد آیا تھا...... اور میں تھی کہ موی کے نام کو گلے کا تعویذ بنائے پھرتی تھی۔ اس نام کو جس کا اس مرد سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا......

میں اس کا ”چہرہ“ دیکھ رہی تھی۔ جسے میں پہلی بار دیکھ رہی تھی...... وہ انسان تھا اسے میرے ساتھ یہی کرنا تھا۔ وہ خدا نہیں تھا جو رحم کرتا...... اور میں...... میں نے انسان کو چاہا تھا...... پا لیا تھا...... اب جب پا لیا تھا...... تو کیا پایا تھا...... ذلت، رسوائی، سفاکی، بے رحمی......

اس نے کہا تھا ان دونوں نے مجھے وہاں اس سڑک پر اس لیے بلوایا تھا کیونکہ وہ مجھے شرمندہ کرنا چاہتے تھے...... میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے...... کیا وہ تب مجھے شرمندہ کرنا چاہتے تھے یا کچھ اور کرنا چاہتے تھے...... جسٹ فار انجوائے منٹ یا جسٹ فار ایڈونچر...... اور انسان شر کو اس طرح مانگتا ہے جیسے خیر کو اور بے شک انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔

اور آئینہ مجھے اپنا عکس دکھا رہا تھا...... میرا میک اَپ سے لتھڑا چہرہ، میرے تراشیدہ بال، میرے عریاں بازو اور سینہ، شیفون کی مہین ساڑھی سے جھلکتا بلاؤز سے نیچے کمر اور ناف تک کا میرا جسم...... میں نے بے یقینی سے اس عکس کو دیکھا یہ مہر سمیع نہیں ہو سکتی تھی۔

”اے اللہ آپ کے فضل اور مہربانیوں کی کوئی کمی نہیں، میں قدم قدم پر آپ کو احسان کرتا ہوا پاتی ہوں۔ مجھ سے آپ کی مہربانیوں کا شکر ادا نہیں ہو پاتا، میری اس کمی کو درگزر فرما مجھے ہر درد اور تکلیف سے محفوظ رکھ۔ میرے دل کے سکون اور میری خوشیوں کی حفاظت فرما۔“ چار سال بعد میری ماں کی آواز کسی اسم اعظم کی طرح میرے وجود کے اندر گونجنے لگی تھی...... اور چار سال بعد...... ٹھیک چار سال بعد مجھے اللہ یاد آ گیا تھا وہ جو انسان کی شاہ رگ سے زیادہ قریب ہوتا ہے...... وہ جو اس کے ظاہر اور باطن کو جانتا ہے اور دونوں کو عیاں کرنے کی قدرت رکھتا ہے...... وہ جس نے چار سال پہلے اس دن میرے سارے راستے مسدود کر کے مجھے گھر سے نکلنے نہیں دیا......

ان دونوں کے سامنے جا کر مجھے ذلت نہیں دی اس کے باوجود کہ میں غلط رستے پر تھی، پر اس نے میرے عیب کو ڈھانپ دیا، مجھ پر رحم کیا، میرے چہرے پر کالک نہیں ملی......

وہ اللہ جس نے میری زبان گنگ کر کے میرے ماں باپ کے سامنے میری عزت رکھی......اور وہ اللہ جس نے اسی شخص کو میرا مقدر بنایا جس کے لیے میں نے دعا نہیں ضد کی تھی......

اور انسان شر کو اس طرح مانگتا ہے جیسے خیر کو اور بے شک انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔

چار سال کے بعد مجھے وہ اللہ یاد آیا تھا جس سے میں رحم مانگتی تھی اور وہ مجھ پر رحم کرتا تھا......اور میں چار سال کے بعد اس کے سامنے کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہی تھی۔

سانوں قبلہ تے کعبہ سوہنا یار دسیندا

اور میں نے اس عشق کا اصلی چہرہ دیکھ لیا تھا جسے میں قبلہ اور کعبہ بنائے بیٹھی تھی...... 1000 روپیہ...... میں نے اللہ کو ایک مرد کے لیے جانچا تھا...... اور اس مرد نے مجھے ایک ہزار روپے کے لیے۔ حساب برابر ہوا۔

سانوں قبلہ تے کعبہ سوہنا یار دسیندا

میں نے ساڑھی کے پلو کے ساتھ اپنے عریاں جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کی...... میں ناکام رہی......شفون کی ساڑھی برہنہ جسم کو ڈھانپ لیتی مگر میری تو روح عریاں ہو رہی تھی۔

''اور انسان شر کو اس طرح مانگتا ہے جیسے خیر کو اور بے شک انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے'' ہاں میں نے چار سال پہلے راتوں ۔ جاگ کر تہجد ۔ اپنے لیے شر ہی لیا تھا۔ وہ شر جس سے اللہ نے مجھے بچا لیا تھا مگر میری ضد تھی کہ مجھے ''وہ'' ملے...... ''وہ'' ہی ملے...... تو پھر اس نے مجھے ''وہ'' دے دیا تھا۔ آخر مجھے اللہ سے مانگنا آتا تھا میری دعا کیسے قبول نہ کرتا......

میں چار سال پہلے کی مہر سمیع ہوتی اور موی میری زندگی میں نہ آیا ہوتا تو میں مراد جیسے شخص کو اپنی زندگی کا ساتھی کبھی نہ بناتی۔ سطحی ذہنیت کا وہ خوبصورت مرد۔ وہ آدمی نہیں تھا جس کے ساتھ میں اپنی زندگی گزارنا چاہتی تھی...... اسے اللہ نے میرے مقدر میں لکھا بھی نہیں تھا مگر میں نے ضد کی تھی، دُعا سے اپنا مقدر بدلا تھا...... اور اس بدلے ہوئے مقدر کو دیکھ کر اب مجھے خوف آ رہا تھا۔ میں کیسے اس آدمی کے ساتھ رہوں گی جسے میں نے خود لیا تھا۔

میرا دل چاہا میں اس گھر سے بھاگ جاؤں، دنیا سے بھاگ جاؤں...... وہاں اب میرے لیے کچھ نہیں رہا تھا...... چند منٹ لگے تھے مجھے اپنے کمرے سے کار کی چابی اٹھاتے اپنا موبائل لیتے...... میں نے اس گھر پر آخری نظر بھی نہیں ڈالی...... میں نے اس گھر کے لیے بہت بڑی قیمت ادا کی تھی۔

لاحاصل

سین 24

ذالعید وہاں سے کب چلا گیا۔ اسے کچھ پتا نہ تھا وہ کہاں تھی؛ کہاں نہیں اسے یہ خبر بھی نہیں تھی۔ وہ ہر حقیقت سے آج پردہ اٹھا دینا چاہتی تھی مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس پردے نے اس کے اپنے وجود کو ڈھانپا ہوا تھا۔ اس کی بدصورتیوں کو' اس کے عیبوں کو' اس کی خامیوں کو...... اور پردہ اٹھنے کے بعد اسے اپنے وجود سے گھن آنے لگی تھی۔ وہ آئینے میں خود کو ہی دیکھ نہیں پا رہی تھی۔

ہاں ذالعید نے ٹھیک کہا۔ میرے آرٹ میں سارا اثر ماما جان ہی کا تو تھا جو لوگوں کو ان تصویروں کی طرف کھینچ لاتا تھا۔ جو رزق مجھ تک کھینچ لاتا تھا اگر مجھ میں قناعت ہوتی تو میرے لئے وہی رزق کافی تھا۔ اتنی ہی شہرت بہت تھی۔ مگر میں...... میں انتظار کرنا نہیں چاہتی تھی پوری دنیا کو ایک جست میں اپنے پیروں تلے لانا چاہتی تھی اور اگر مجھ میں قناعت ہوتی ماما جان! تو میں ذالعید کا خواب دیکھنے کی کوشش کیوں کرتی یا اگر وہ مل گیا تھا تو پھر مجھے سکون کیوں نہیں مل گیا...... نہیں ماما جان! میرے اندر قناعت تھی ہی نہیں۔ میں تو ہر چیز کو سیڑھی بنا کر آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ اپنے آرٹ کو' آپ کو' ذالعید کو...... ہر چیز کو...... اور کل شاید اپنی اولاد کو بھی۔

آج تک میں آپ کی اور ذالعید کی خواہشوں کا ہر قدم پر خون کرتی رہی تو کل میں اپنی اولاد کے ساتھ بھی یہی کرتی۔ ان کی خواہشات اور خوشیوں کو بھی اپنی غرض کی بھینٹ چڑھا دیتی۔

میں نے اپنے ہر رول میں یہی تو کیا ہے چاہے وہ بیٹی کا ہو یا بیوی کا...... کاش آپ مجھے بہت پہلے اپنے ماضی کے بارے میں سب کچھ بتا دیتیں...... کاش آپ مجھے...... مگر اس کا کیا فائدہ ہوتا میں تو شاید تب بھی آپ کو اسی طرح بلیک میل کرتی رہتی بلکہ شاید اس سے زیادہ بری طرح۔

میں تو صرف یہ سوچ رہی ہوں ماما جان! کہ میں نے تو آپ کو اور ذالعید کو کتنی تکلیف دی ہے۔ کیا میں کبھی اتنی ہمت کر سکوں گی کہ دوبارہ آپ کے سامنے یا ذالعید کے سامنے جا سکوں۔ یہ کہہ سکوں کہ مجھے معاف کر دیں اور معافی...... معافی کیا ہوتی ہے؟ معاف کر دینا کیا ہوتا ہے؟

آپ مجھے اس لئے باہر لے جانا نہیں چاہتی تھیں کیونکہ آپ خوفزدہ تھیں اپنی زندگی سے۔ اپنے تجربات سے۔ آپ مجھے ایسے کسی بھی حادثے سے بچانا چاہتی تھیں اور میں سوچتی تھی؛

آپ کو ایک غلام چاہئے جو بڑھاپے میں آپ کے پاس رہے۔ آپ کی خدمت کرتا رہے۔ میں واقعی ان لوگوں میں سے ہوں جن کی آنکھوں پر غرض کی پٹی بندھی ہوتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ساری دنیا ایسی پٹی باندھے پھرتی ہے۔

وہ گم صم صوفہ پر بیٹھی ہوئی تھی جب ذالعید اندر آیا۔ مریم نے اسے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ وہ وارڈ روب کی دراز کھول کر کچھ رقم اپنے والٹ میں ٹھونس رہا تھا۔ وارڈ روب بند کرتے ہوئے اس نے ایک بار مریم کو پلٹ کر دیکھا۔

"تمہاری وجہ سے میری ماں ہاسپٹل جا پہنچی ہے...... تم یاد رکھنا اگر میری ماں کو کچھ ہوا تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔" اس نے انگلی اٹھا کر کہا اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

"ماما جان......!" اس کے دل کی دھڑکن جیسے رکنے لگی۔

"کیا یہ سب واقعی میں نے آپ کے ساتھ کیا ہے؟ کیا واقعی میں ہوں وہ جس نے ......" اسے یک دم جیسے خود سے خوف آنے لگا۔

"میں کون ہوں؟"

"آخر کون ہوں؟ The incarnation of evil (مجسم شیطان) میری خواہشات نے مجھے کو کیا بنا دیا ہے۔ میرے خواب مجھے کہاں لے آئے ہیں؟" اسے اپنی پوری زندگی ایک فلم کی طرح اپنے سامنے چلتی محسوس ہوئی۔

The trees ask me
And the sky
And the sea asks me
Who am I? Who am I?

اسے کانونٹ میں گائی جانے والی ایک نظم یاد آنے لگی۔

میں ...... میں اُمِّ مریم ہوں۔ ایک طلاق یافتہ عورت کی بیٹی ایسی عورت جس کو اس کے شوہر نے کم جہیز لانے پر طلاق دے دی۔

(کیا پیسے کی یہ خواہش میں نے اس عورت کے خون سے لی جسے میری پیدائش سے پہلے اور بعد میں صرف یہ کہا جاتا تھا' تمہارے پاس کیا ہے؟ تم کیا لائی ہو؟")

ایسی عورت جس نے مجھے تین سال کی عمر میں اس وقت کسی دوسرے کو تھما دیا جب اسے دوسری شادی کرنی تھی اور کوئی اس کی بیٹی کو اس کے ساتھ قبول کرنے پر تیار نہیں تھا نہ دوسرا شوہر نہ سابقہ شوہر نہ ہی اس کے میکے والے۔ ہر جگہ غربت تھی۔ "تو کیا یہ اس غربت نے ......؟"

ایک ایسے باپ کی بیٹی جو پیسے کے لالچ میں گرفتار تھا...... اس حد تک کہ اس نے رشتے

توڑنے میں بھی دیر نہیں لگائی...... اس نے اپنی بیوی کو بیٹی سمیت چھوڑ دیا۔ (کیا یہ ہوس میں نے اس شخص سے لی؟)

میں اُمِّ مریم ہوں جسے تین سال کی عمر میں دو ایسے انسانوں نے گود لیا...... جن کے پاس صبر اور شکر کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک وہ مرد جس نے اپنی ساری زندگی اپنی بہنوں کی زندگیاں سنوارتے گزار دی۔

ایک وہ عورت جو صبر وقناعت کا نمونہ تھی۔ جس نے ساری زندگی کھلے ہاتھ کے بجائے بند مٹھی کے ساتھ گزاری۔ جس نے اپنی آزمائشوں اور تکلیفوں کو دنیا کے ہر شخص کو روک روک کر بتانے کے بجائے ان پر صبر کیا اور خاموشی اختیار کر لی۔ میں نے ان دونوں سے کچھ نہیں لیا۔ وہ سکون کی زندگی گزار رہے تھے۔ مجھے لگا وہ مجبوری کی زندگی گزار رہے ہیں۔ میں دو مومنین کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔ ہاں دو مومنین کے ساتھ مگر میں منافقین کے اس گروہ سے تھی جسے بینائی سے محروم رکھا گیا تھا۔ جن کے دلوں پر مہر لگا کر انہیں دنیا میں اتارا جاتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں انہیں جنت میں بھیج دیا گیا ہے۔

میں اُمِّ مریم ہوں جسے ان مومنین سے وابستگی پر شرمندگی تھی۔ میرا خیال تھا' ان دونوں کے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے جسے میں دنیا سے ان کے تعارف کے لئے استعمال کروں مگر وہ دونوں وہ انسان تھے جن کی وجہ سے دنیا پہچانی جاتی ہے۔

مَیں اُمِّ مریم ہوں جس نے اپنے ہر ہنر' ہر فن' ہر خوبی پر غرور کیا' اتنا غرور کہ اس کو اپنے علاوہ دنیا میں کچھ بھی نظر آنا بند ہو گیا جس کی خواہش تھی' وہ ہر اخبار کے فرنٹ پیج پر نظر آئے۔ لوگ اس کو دیکھیں' پہچانیں اور اس پر رشک کریں' جس نے صرف دنیا میں اپنی پہچان کے لئے اپنے کام کو رنگوں کے بجائے کیچڑ سے سجانا شروع کر دیا۔ اس کا کام روح سے جسم پر آ گیا۔ آسمان سے پاتال میں اترنا شروع ہو گیا۔ مگر اس کے بدلے اس کے اردگرد دولت کا ڈھیر لگنا شروع ہو گیا۔ نام اور شہرت ملنی شروع ہو گئی...... لوگوں کی داد اور عزت...... "عزت" ہاں جو مجھے عزت لگتی تھی وہ بھی ملی۔

میں اُمِّ مریم ہوں جسے غلطی سے یا خوش قسمتی سے ایک ایسا شخص مل گیا جو میرا حق نہیں تھا۔ ماما جان کی امانت تھی جسے میرے توسط سے انہیں لوٹایا گیا تھا اور میں نے سوچا وہ کوہ نور ہیرا ہے جو مجھے تقدیر نے دیا ہے۔ اس شخص کی رگوں میں اسی عورت کا خون تھا جس نے آزمائش میں صبر کیا اور اس شخص نے بھی یہی کیا۔ مجھے صبر سے برداشت کیا۔

میں اُمِّ مریم ہوں وہ عورت جس نے اپنی زندگی میں صرف ایک چیز سیکھی۔ نظریہ ضرورت میں نے ہر چیز کو استعمال کیا۔ بابا کو' ماما جان کو' ذالعید کو اور اپنے آرٹ کو۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی ٹرانس میں ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ زندگی میں

پہلی بار وہ ٹرانس سے باہر آ رہی تھی۔ مادیت کے ٹرانس سے۔ اپنے آرٹ اسٹوڈیو کی طرف جاتے ہوئے اسے وہ دو تصویریں یاد آ رہی تھیں جو اس نے بہت سال پہلے بنائی تھیں۔ Belief اور Desire (خواہش اور ایمان) ...... اسے یاد تھا اس نے Desire (خواہش) والی پینٹنگ بناتے ہوئے ماما جان کے منہ سے اس کے لئے یہ کیپشن سنا تھا۔ اسے تصویر کے لئے یہ کیپشن پسند آیا ...... اور جب وہ Belief (ایمان) بنا رہی تھی تب بھی اس کا کیپشن ماما جان نے ہی دیا تھا اور یہ وہی دونوں پینٹنگ تھیں جس نے ذالعید کو اس کا پہلا تعارف دیا تھا۔ وہ دو پینٹنگز نہیں تھیں۔ ماما جان اور وہ خود تھی۔ وہ Desire (خواہش) تھی۔ ماما جان Belief (ایمان) تھیں۔ اس نے ساری زندگی خواہش کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ یہ مل جائے' وہ مل جائے' اور اب جب سب کچھ مل گیا تو اسے اپنے پاس موجود ہر چیز سے خوف آنے لگا تھا...... ہر چیز سے۔

اسے رابرٹ فروسٹ کی After Apple Picking (سیب توڑنے کے بعد) یاد آئی جسے بہت سال پہلے اس نے پڑھا تھا اور پھر اکتا کر اس نظم کو ایک طرف پھینک دیا تھا۔ آج اسے وہی ساری نظمیں یاد آ رہی تھیں۔

My long two-pointed ladder is sticking
Through a tree Towards heaven still
And there is a barrel that I didn`t fill
Beside it, and there may be two or three
Apples I didn`t pick upon some bough
But I am done with apple-picking now

(میں نے اپنی لمبی سیڑھی آسمان کی طرف سیب کے درخت کے ساتھ لگائی ہوئی ہے اور وہاں ایک بیرل پڑا ہے جسے میں ابھی تک سیبوں سے بھر نہیں سکا اور شاید کسی شاخ پر ابھی بھی چند سیب ایسے ہیں جو میں اتار نہیں سکا' مگر اب میں سیب چنتے چنتے تھک گیا ہوں۔)

وہ اپنے سٹوڈیو میں پہنچ گئی۔ مشینی انداز میں اپنی پینٹنگز اتار کر اس نے اسٹوڈیو کے وسط میں جمع کرنی شروع کر دیں۔ وہ برہنہ جسم جسے وہ آرٹ کہتی تھی۔ یونیورسل آرٹ جس نے اسے دنیا کے بازار میں راتوں رات شہرت دلا دی تھی۔ اسی کی طرح نفس زدہ لوگوں کی شہرت اور داد۔ جو ہر چیز میں برہنگی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں' چاہے وہ تصویر میں ہو یا تحریر میں۔ چاہے وہ reel life (فلمی زندگی) میں ہو یا Real life (حقیقی زندگی) میں۔

I feel the ladder sway as the boughs bend
And I keep hearing from the cellar bin

The rumbling sound
Of load on load of apples coming in
For I have had too much
Of apple-picking I am over tired
Of the great harvest I myself desired

(میں جھکی ہوئی شاخوں کے ساتھ سیڑھی کو ہلتا محسوس کرتا ہوں اور میں کنٹینرز میں پڑے ہوئے سیبوں کے ڈھیر پر ایک اور ڈھیر گرنے کی آواز سنتا رہتا ہوں۔ مگر میں ضرورت سے زیادہ سیب اکٹھے کر چکا ہوں۔ میں سیبوں کی اس شاندار فصل کو اکٹھا کرتے کرتے تھک چکا ہوں۔ جس کی میں نے خود خواہش کی تھی)۔

وہ اسٹوڈیو میں کھڑی تصویروں کے اس ڈھیر کو جلتا دیکھ رہی تھی۔ ان سے اٹھتے ہوئے شعلے اس کے اپنے اندر اٹھنے والے شعلوں سے زیادہ بلند نہیں تھے۔ وہ اب اسٹوڈیو کے بند دروازے کو دھڑ دھڑائے جانے کی آوازیں سن رہی تھی۔ ملازم اکٹھے ہو چکے تھے مگر وہ جانتی تھی جب تک یہ دروازہ کھلے گا وہ ساری تصویریں جل کر راکھ ہو چکی ہوں گی۔

15 اگست 2001

سین 25

میرا باپ دو سال بیمار رہا تھا' اس کی وفات پر میں پاکستان آیا تب اسے دفنایا جا چکا تھا۔ میں نے اس کا بھی چہرہ نہیں دیکھا ...... میں رویا بھی نہیں ...... کئی دن میں خاموش رہا۔ سلیمہ نے کوشش کی کہ وہ مجھ سے میرے باپ کے بارے میں بات کرے مگر میں ہر بار موضوع بدل دیتا۔ پھر شاید وہ جان گئی کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے دوبارہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

لندن واپس آنے کے کئی ماہ بعد تک میں اسی طرح گم صم رہا۔ باپ کے مرنے کے بعد میرا پورا خاندان مکمل طور پر ختم ہو گیا تھا۔ ایک عجیب سا احساس تنہائی مجھے ہر وقت اپنی لپیٹ میں رکھتا تھا۔

ایک رات میں نے تین بجے سلیمہ کو جگایا۔ وہ پریشان ہو گئی۔

''کیا بات ہے؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں ...... تم مجھ سے باتیں کرو''۔

''کیا باتیں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''کوئی بھی بات ...... کچھ بھی ......''

''اچھا ......'' وہ مجھے پورے دن کی روداد سنانے لگی۔ میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ شاہد کی شرارتوں کے بارے میں بتاتی رہی' میں سنتا رہا۔ ٹی وی پر آنے والے ایک پروگرام کی تفصیلات سناتی رہی پھر وہ تھک کر خاموش ہو گئی۔

''آپ بھی تو کچھ کہیں ......'' اس نے جیسے شکایت کی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ سر جھکائے میں نے اس سے کہا۔

''ابا نے ...... مرنے سے پہلے ...... تم سے ...... کچھ کہا ...... میرے بارے میں؟'' وہ ساکت ہو گئی۔ شاید اسے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ باپ کی وفات کے دس ماہ بعد میں اس سے پوچھ رہا تھا کہ کیا میرے باپ نے میرے بارے میں کچھ کہا تھا۔

''ہاں ......'' اس بار میں سن ہو گیا۔ میں ہمت نہیں کر پایا کہ اسے وہ الفاظ دہرانے کے لیے کہوں ...... میں بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھتا رہا ...... وہ اٹھ کر وارڈ روب کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر وہ وہاں کوئی چیز تلاش کرتی رہی پھر وہ ایک پیکٹ لے کر میری طرف چلی آئی۔ میرے قریب بیڈ پر بیٹھ کر اس نے پیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک پوٹلی نکال لی' میرا سانس رک گیا۔ میں اس کپڑے کو ساری عمر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وہی کپڑا تھا جسے میں نے اپنے بھائی اور ماں کی لاشیں گھر لاتے وقت اپنے باپ کے کندھے پر خون سے لتھڑا ہوا دیکھا اور جس سے میرے باپ نے میرے بھائی کے جسم سے مٹی اور تنکے صاف کیے تھے۔ اور پاکستان واپس آنے کے بعد اسی میں میرے باپ نے ایک مٹھی مٹی ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ میں نے اس کے بعد وہ کپڑا اپنے باپ کے کندھے پر کبھی نہیں دیکھا' اور آج اتنے سالوں کے بعد وہ پوٹلی میری بیوی کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے وہ پوٹلی میری طرف بڑھا دی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اسے پکڑ لیا۔

''انہوں نے کہا تھا' جمال سے کہنا واپس ضرور آئے۔ میں نے اس مٹی کے رزق سے اس کی پرورش کی ہے۔ اس پر فرض ہے کہ وہ یہ رزق میری مٹی کو لوٹا دے''۔ میں گم صم اپنی بیوی کو دیکھتا رہا۔

وہ میرے رونے کی رات تھی۔ اس رات میں رویا تھا ...... اسی طرح جس طرح میرا باپ زمین سے لپٹ کر روتا رہا تھا۔ میں جان گیا تھا' وہ مٹی میرے لیے رکھی گئی تھی۔ میرا باپ جو ساری عمر ہندوستان اور کانگریس کے گن گاتا رہا ...... سردار پٹیل' مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی کی باتیں سنا سنا کر جھومتا رہا۔ وہ مرنے سے پہلے میرے لیے پاکستان کی مٹی چھوڑ کر گیا تھا۔ شاید اپنے بیٹے کے جسم کے ٹکڑے اکٹھے کرتے ہوئے اسے پہلی بار احساس ہوا ہو گا کہ مذہب کی بنیاد پر کھڑا کیا ہوا دو قومی نظریہ دیوانے کی بڑ نہیں' حقیقت تھی۔ شاید میری ماں کی کٹی ہوئی گردن درخت سے اتارتے ہوئے اسے احساس ہوا ہو گا کہ آزادی کیا ہوتی ہے۔ شاید شکیلہ باجی کی لاش' ڈھانپتے ہوئے اسے پتا چلا ہو گا کہ ہندو کا پالتو کتا بن جانے کا مطلب کیا ہے۔ اور شاید میری دونوں بہنوں کو گھر میں جلاتے ہوئے اسے پتا چلا ہو گا کہ آزادی' قربانی مانگتی ہے۔ حاصل کرنے کے لیے بھی اور قائم رکھنے کے لیے بھی۔

امر بیل

سین 26

فضا میں تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ہی جبار چلایا۔

"حملہ سر۔" اس کا پاؤں بریک پر تھا۔ وہ آگے کچھ نہیں کہہ سکا۔ وہ دو طرف سے گولیوں کی زد میں آیا تھا۔ ڈرائیور سیٹ کی کھڑکی اور ونڈ اسکرین سے ...... اچانک لگنے والے بریک کے جھٹکے سے عمر یک دم جھک گیا۔ اس کا سر ڈیش بورڈ کے پاس تھا۔ جب اس نے جبار کی چیخیں سنیں اور ونڈ اسکرین کی کرچیوں کو اڑتے دیکھا۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس نے پہلے اپنے کندھے اور پھر اپنی گردن میں لوہے کی گرم سلاخیں سی گھستی محسوس کیں۔ وہ بے اختیار چلایا تھا پھر یکے بعد دیگرے اس نے کچھ اور سلاخوں کو اپنی گردن' کندھے اور کندھے کی پشت میں دھنستے محسوس کیا...... کتنی؟ وہ نہیں بتا سکتا تھا۔ پھر فضا میں یک دم خاموشی چھا گئی۔ اس کا سر ڈیش بورڈ پر ٹکا ہوا تھا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بھی کوئی کراہ رہا تھا۔ درد کی شدت ...... چند سیکنڈز کے لیے کھلی نظروں سے اس نے ڈیش بورڈ سے سر ٹکائے ٹکائے اپنی آنکھوں میں اترتی دھند کو جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے نیچے دیکھا۔ اس کے گھٹنے کے قریب خاکی ٹراؤزرز خون سے بھیگ رہی تھی اس کی گردن کے اطراف اور عقب سے نکلنے والا خون ایک دھار کی صورت میں اس کی گردن کے نیچے والے حصے سے بہہ رہا تھا۔ اس نے سائرن کی آواز سنی ...... اس نے سانس لینے کی کوشش کی وہ جانتا تھا۔ پولیس موبائل ابھی اس کے پاس ہوگی وہ جانتا تھا وہ اگلے چند منٹوں میں ہاسپٹل لے جایا جائے گا' اس کے ذہن میں بہت سارے خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ چہرے آوازیں ...... ماضی ...... حال ...... چیزیں ...... لوگ ...... وہ سانس لینے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ چیخ یا کراہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے احساسات مکمل طور پر مفلوج نہیں ہوئے تھے اس نے دیکھا اس کے ہاتھ میں دبا سگریٹ خون کے اس تالاب میں گرا ہوا تھا جو اس کے پیروں کے پاس پائیدان میں جمع ہو گیا تھا۔ مگر وہ ابھی سلگ رہا تھا۔ اس میں سے اٹھتا ہوا دھواں عجیب سے انداز میں اوپر اٹھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ میں اس نے سگریٹ کے شعلے کو مکمل طور پر بجھتے دیکھا پھر دھواں بند ہو گیا۔

اس کی آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا اور اس کی ناک سے خون وہ اپنے سر کو سیدھا کرنا

چاہتا تھا کوئی اس کا دروازہ کھول رہا تھا کوئی اس کے قریب بلند آواز میں بول رہا تھا۔

اس نے علیزہ کے چہرے کو اپنے ذہن کی اسکرین پر ابھرتے دیکھا...... بے اختیار اس نے سانس لینے کی کوشش کی پھر اس نے اس کے ساتھ جنید کو دیکھا وہ سانس نہیں لے سکا۔ اسے اپنا دایاں بازو کسی کے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں محسوس ہوا۔ کوئی اس کے دائیں کندھے پر ماتھا ٹکائے رو رہا تھا۔ وہ ان آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی نمی کو شرٹ کے اندر اپنے بازو پر محسوس کر رہا تھا۔

"مجھ سے یہ مت کہو کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے' تمہیں پتہ ہے اس سے کتنی تکلیف ہوتی ہے مجھے۔"

اس نے اپنے بائیں کندھے پر کسی کے ہاتھ کی گرفت محسوس کی' کوئی اسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے دائیں کندھے کو کسی کی گرفت سے آزاد ہوتے پایا۔ ایک گہری تاریکی نے اس کو اپنے حصار میں لے لیا۔

ڈوبتے ہوئے ذہن کے ساتھ جو آخری احساس تھا' وہ کسی کے اسے گاڑی سے نکالنے کی کوشش کا تھا۔ اس کے ذہن میں ابھرنے والا آخری خیال اس کی ممی کا تھا۔

میری ذات ذرّہ بے نشاں

سین 27

''آؤ سارہ! آج تو بہت دیر لگا دی۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔''

سارہ نے غور نہیں کیا کہ اس نے اسے آمنہ کے بجائے سارہ کیوں کہا تھا۔ وہ بغیر کوئی جواب دیئے اندر آ گئی' لفافے اس نے دیوار کے پاس پڑی تپائی پر رکھ دیئے۔ بیگ گدے پر پھینکنے کے بعد اس نے چادر اتاری اور تھکے تھکے انداز میں اسے تہہ کرنے لگی' گل اور عذرا خلاف معمول خاموش تھیں اس نے انہیں دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

''ہیلو کیسی ہو سارہ؟'' مدھم لیکن بہت شستہ فرنچ میں اسے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت ہو گئی۔ آواز اس کی سماعتوں کے لئے ناآشنا نہیں تھی۔ وہ اسے لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔

کمرے میں Eternity کی پھیلی ہوئی مانوس سی مہک کو اس نے اب محسوس کر لیا تھا۔ سر اٹھا کر اسے کمرے میں ڈھونڈنے کی بجائے اس نے اسی طرح گردن کو حرکت دیئے بغیر سر جھکائے ہوئے فرش پر نظریں دوڑانا شروع کر دیا تھا۔ کمرے کے دائیں کونے میں لیدر شوز پر اس کی نظر اٹک گئی تھی۔ وہ وہاں کھڑا تھا۔ سینے پر بازو لپیٹے' دیوار سے ٹیک لگائے۔ سیاہ جینز اور اسی کلر کی لیدر جیکٹ میں ملبوس پرسکون' سنجیدہ' نظر اس پر جمائے ہوئے۔ سارہ نے صرف یک بار اسے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور پھر سر جھکا لیا چادر کو ایک بار پھر کھول کر اس نے کندھوں پر ڈال لیا۔

''سارہ! یہ تم سے ملنا چاہتے تھے۔ کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہی ہمیں بتایا کہ تم آمنہ نہیں سارہ ہو اور یہ کہ تم ان کی منکوحہ ہو۔''

کمرے میں گل کی آواز گونجی۔ سارہ کا دل نہیں چاہا کہ وہ گل اور عذرا کی شکل دیکھے۔

''ہم ذرا ساتھ والے فلیٹ میں جا رہے ہیں۔ تمہیں ان سے جو بات کرنا ہے۔ کر لو۔''

سارہ نے عذرا کو کہتے اور پھر دروازہ کرتے سنا تھا۔

''میں تمہیں صرف یہ سمجھانے آیا ہوں کہ فرار کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔'' کمرے میں اس کی آواز گونجی تھی۔ سارہ نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ وہ اب پہلے والی جگہ سے

آگے بڑھ آیا تھا۔

''مجھے کسی کی کوئی بات نہیں سننی ہے' تم یہاں سے جاؤ۔'' اس کے چہرے کو دیکھے بغیر اس نے کہا تھا۔

''لیکن مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے اور میں یہاں سے جاؤں گا نہیں۔'' وہ اب بھی پرسکون تھا۔

وہ چلا اٹھی ''میں نے کہا' تم یہاں سے جاؤ۔''

''ہاں چلاؤ اور چلاؤ' اس سے تمہارا ڈپریشن دور ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں چیخنے چلانے سے انسان کا کتھارسس ہو جاتا ہے اور تمہیں اس وقت اسی ایک چیز کی ضرورت ہے۔'' وہ کسی ماہر سائیکالوجسٹ کی طرح تشخیص کر رہا تھا۔ وہ یک دم چپ ہو گئی۔

''اور مجھے تم سے بہت کچھ پوچھنا بھی ہے۔'' حیدر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہیں جو کچھ پوچھنا ہے اپنے باپ سے پوچھو۔ میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔''

''مجھے پاپا سے جو کچھ پوچھنا تھا پوچھ چکا ہوں' اب تمہاری باری ہے۔ مجھے بتاؤ تم نے مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا ہے؟ میں نے تم پر کیا ظلم کیا تھا؟''

''میری ماں نے کسی پر کیا ظلم کیا تھا! تمہارے باپ نے ان سے کس چیز کا بدلہ لیا؟'' وہ فرش پر بچھے ہوئے بستر پر بیٹھ گئی۔

''ہاں۔ تو یہ سوال تمہیں پاپا سے کرنا چاہئے تھا۔ پوچھنا چاہئے تھا ان سے بلکہ میرے ساتھ چلو اور چل کر ان سے پوچھو مگر تم میں اتنی ہمت کہاں کہ تم ان کے سامنے کھڑی ہو کر بات کر سکو۔'' وہ اسے چیلنج کر رہا تھا۔

''میں تمہارے گھر دوبارہ کبھی جانا چاہتی ہوں نہ تمہارے باپ کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں ان سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔'' وہ اس پر غرائی تھی۔

''اگر تم میرے باپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی تھیں تو پھر تم نے میرا پرپوزل قبول کیوں کیا؟ مجھ سے نکاح کیوں کیا۔ میرے ساتھ۔'' سارہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''تب تک مجھے حقیقت کا پتا نہیں تھا اور مجھے سب کچھ پہلے پتا چل جاتا تو تمہارے ساتھ نکاح تو دور کی بات ہے' میں کبھی تمہارے باپ کے پاس بھی نہ جاتی۔ میں کبھی اس شخص کے پاس جانا پسند نہ کرتی جس نے میری ماں کی زندگی برباد کر دی جس نے ان کو بے عزت کیا۔''

''سارہ! تم یہ بات مت کہو' تمہیں یہ بات کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہاں تمہاری امی کہہ

سکتی تھی کیونکہ ان پر ظلم ہوا تھا اور نہوں نے کسی سے اس کا بدلہ نہیں لیا تھا مگر تم بدلہ لے چکی ہو۔ تم نے مجھے بے عزت کیا ہے اگر تمہاری ماں بے قصور تھیں تو مجھے بتاؤ۔ میں نے کون سا گناہ کیا تھا۔ کیا تم نے سوچا تمہارے اس طرح چلے جانے سے میں لوگوں کے سامنے تماشا بن کر رہ جاؤں گا؟ نہیں' تم نے نہیں سوچا بالکل اسی طرح جس طرح میرے دادا' دادی نے نہیں سوچا تھا۔ اسی طرح جس طرح میرے باپ نے نہیں سوچا تھا۔ تم میں اور ان میں کیا فرق ہے' بتا سکتی ہو تو بتاؤ؟"

وہ ایک کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔

"تمہاری امی کا دل مرنے کو چاہا ہوگا۔ میرا دل بھی چاہا تھا میں خودکشی کر لوں تمہاری امی مظلوم تھیں۔ تم مظلوم نہیں ہو۔"

"میں نے تم سے یا کسی سے بھی کوئی بدلہ نہیں لیا۔ میں بس تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ تمہارے گھر آنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے میں وہاں سے بھاگ آئی۔ یہ میں نے بعد میں سوچا تھا کہ اس سے۔"

حیدر نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ "دادا نے بھی یہ بعد میں سوچا تھا کہ انہوں نے تمہاری امی پر ظلم کیا۔ دادی نے بھی یہ بعد میں سوچا تھا کہ انہوں نے تمہاری امی کو رسوا کر دیا' پاپا کو بھی یہ بعد میں خیال آیا تھا کہ انہوں نے تمہاری امی کی زندگی برباد کر دی۔ اگر تم اپنے اس اقدام کو justify (جائز) کرتی ہو تو ان کو بھی کرو' کوئی بھی غلط کام کرتے ہوئے نہیں سوچتا کہ وہ غلط کام کر رہا ہے۔ ہر ایک بعد میں ہی سوچتا ہے۔ وہ تم ہو پاپا ہوں یا دادا' دادی۔"

سارہ نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"بہت کچھ' یہ کہ تم پاپا کو معاف کر دو اور یہ کہ تم میرے ساتھ چلو۔"

"میں دونوں کام نہیں کر سکتی۔" اس نے قطعی انداز میں جواب دیا تھا۔

"پھر تیسرا کام میں کر سکتا ہوں یعنی تم کو طلاق دے دوں۔"

سارہ نے بے اختیار سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور پھر گھٹی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ "دے دو۔"

وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا پھر اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا تھا۔ "طلاق لے کر کیا کرو گی؟ کیسے رہو گی؟ زندگی کیسے گزارو گی؟"

"ویسے ہی گزاروں گی جیسے میری ماں نے گزاری تھی۔"

لاحاصل

سین 28

پونے چار بجے وہ اسلامک سینٹر پہنچ گئی تھی۔ پروفیسر عبدالکریم بن اسود اپنے آفس میں اس کے منتظر تھے۔ ہمیشہ کی طرح وہ اس سے گفتگو میں مصروف ہو گئے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے چھوٹے موٹے کام بھی نپٹا رہے تھے۔ اپنی ڈاک دیکھ رہے تھے۔ پہلے سے لکھ کر رکھے گئے کچھ خطوط کو لفافوں میں بند کر کے پتے لکھ رہے تھے۔ ایک دو بار انہوں نے اپنے پیجر پر آنے والے پیغام دیکھے۔ وہ کسی دلچسپی کے بغیر ان کی باتیں سنتی اور معمول کے کام دیکھتی رہی۔ ان سے تمام ملاقاتوں میں آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ ان کی باتوں پر توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ اس کا ذہن کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔

"ڈیوڈ' حدید اور ...... اب یہ تیسرا شخص اور اگر زندگی اس تیسرے شخص کے ساتھ ہی گزارنی ہے تو پھر پہلے دونوں آدمیوں کو میری زندگی میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ یا ...... یا مجھے ان سے ملنے کی کیا ضرورت تھی۔"

اسے اپنے گلے میں نمی اترتی محسوس ہوئی تھی۔

"کیا آپ نے اسے میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے؟" اس نے تیسری بار پروفیسر عبدالکریم سے پوچھا تھا۔

"ہاں۔"

"ہاں اور اسے کوئی اعتراض نہیں ہے؟" اسے ابھی بھی بے یقینی تھی۔

وہ مسکرائے تھے۔ "تمہارے خیال میں اسے کیا اعتراض کرنا چاہیے؟"

وہ خاموش رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں تم پریشان ہو۔ یہ نارمل چیز ہے۔ تم اس سے ملیں نہیں' اس لیے تمہارے دل میں بہت سے خدشات ہیں۔ جب تم اس سے مل لو گی تو تمہارے سارے خدشات ختم ہو جائیں گے۔ وہ اپنی عمر کے دوسرے لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ بہت میچور اور بہت ٹھنڈے مزاج کا مالک ہے۔ تمہیں اس سے بات کر کے اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے بارے میں میری

رائے اتنی اچھی کیوں ہے۔"

وہ اپنے اسی مخصوص انداز میں نرم اور دھیمی آواز میں اسے سمجھا رہے تھے۔

"سوا چار بجنے والے ہیں۔ وہ بس آنے ہی والا ہوگا۔ وقت کی پابندی کرتا ہے۔ اس کی اچھی عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔" انہوں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"وقت کی پابندی ......" اسے کوئی بے اختیار یاد آیا تھا۔ آنکھوں میں آنے والی نمی کو روکنے کے لیے اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا تھا۔

"ہر چیز کو کبھی نہ کبھی اپنے مقام پر جانا ہی ہوتا ہے۔" بہت عرصہ پہلے پروفیسر عبدالکریم کی کہی ہوئی ایک بات اسے یاد آئی تھی۔

"اور شاید میرا مقام یہ تیسرا شخص تھا' ڈیوڈ یا حدید نہیں۔ اور کاش میں یہ سب پہلے جان گئی ہوتی۔"

وہ پروفیسر عبدالکریم کے سامنے پڑی میز کی چمک دار سطح کو دیکھتے ہوئے سوچتی رہی۔

چار بج کر دس منٹ پر دروازے پر کسی نے دستک دی تھی اور پھر دروازہ کھول کر کوئی اندر آ گیا تھا۔ اسے اپنی پشت پر قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ اس نے اپنے دل کی دھڑکن کو تیز اور ہاتھوں کو سرد ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ پھر اس نے ایک آواز سنی تھی۔ گرم کمرے میں بھی اس کا پورا جسم جیسے برف کی چٹان بن گیا تھا۔ پروفیسر عبدالکریم اب آنے والے سے بات کر رہے تھے۔ ثانیہ نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنے ماتھے پر نمی محسوس کرنے کی کوشش کی تھی' ماتھا خشک تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے پسینہ آ گیا ہوگا۔ آنے والا اس کے پاس سے گزر کر پروفیسر عبدالکریم کے بائیں جانب میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسی کھینچنے لگا تھا۔ ثانیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ پروفیسر عبدالکریم نے دونوں کا تعارف کروایا تھا۔ وہ بہت دیر تک اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا سکی تھی۔ وہ بھی کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔ ثانیہ نے اس کے چہرے سے نظر ہٹالی تھی۔ وہ اب بڑی سنجیدگی سے پروفیسر عبدالکریم سے باتوں میں مصروف تھا۔

"تم یقیناً اسے پسند کرو گی۔ بہت میچور اور ٹھنڈے مزاج کا مالک ہے۔" پروفیسر عبدالکریم نے چند منٹ پہلے اس کے بارے میں کہا تھا۔

"ہاں وہ دیکھنے میں ایسا ہی لگ رہا ہے۔ میچور اور Cool-headed میں کیا کوئی بھی لڑکی اسے پسند کر سکتی ہے۔ چاہے پہلے اس کی زندگی میں کوئی آیا ہو یا نہیں۔" اس نے تلخی سے سوچا تھا۔

"تم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں تقریباً سب کچھ پہلے ہی جانتے ہو۔ میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے میں نے تم لوگوں کو آگاہ نہ کر دیا ہو۔ اب یہ ضروری ہے

کہ تم لوگ ایک دوسرے سے گفتگو کرو۔ تاکہ ایک دوسرے کے بارے میں مزید جو کچھ جاننا ضرور ہے' جان سکو۔ میں کچھ دیر کے لیے کمرے سے باہر چلا جاتا ہوں۔ تم لوگ اتنی دیر آپس میں بات کر سکتے ہو۔"

پروفیسر عبدالکریم کمرے سے نکل گئے تھے۔ ثانیہ نے گردن موڑ کر اپنی پشت پر بند ہوتا ہوا دروازہ دیکھا تھا' پھر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کی رنگ سے اپنی جینز پر نظر نہ آنے والی لکیریں بنانے میں مصروف تھا۔ ثانیہ نے اس پر سے نظر ہٹالی تھی۔ سامنے فرنچ ونڈوز سے اس نے باہر نظر آنے والے منظر میں اپنی دلچسپی کی کوئی چیز ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی' کوئی بھی چیز۔ وہ ناکام رہی تھی۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی اور خاموشی کو توڑنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔

"کون پہلے بولے گا' میں یا یہ؟ اور جو پہلے بات شروع کرے گا' وہ کیا کہے گا؟" ثانیہ نے سوچنے کی کوشش کی تھی۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔

"میرے پاس تو کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے مگر یہ کیوں خاموش ہے۔ اس کے پاس تو کہنے کے لیے بہت کچھ ہونا چاہیئے' بہت کچھ۔ اس کے پاس تو لفظوں کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔"

ثانیہ نے سوچا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا تھا۔ ایک منٹ' دو منٹ' تین منٹ' چار منٹ' پانچویں منٹ پر ثانیہ نے اسے ایک گہری اور لمبی سانس لیتے ہوئے سنا تھا۔ یوں جیسے وہ کسی ٹرانس سے باہر آ گیا تھا۔

"اور اب یہ کیا کہے گا؟" ثانیہ نے سر جھکائے جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی۔

"پچھلے چھ سال میں جس چہرے کو دیکھنے کی میں نے سب سے زیادہ خواہش کی تھی' وہ تمہارا چہرہ تھا اور آج یہاں تمہیں دیکھنے کے بعد جس چہرے کو میں کبھی دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا' وہ بھی تمہارا چہرہ ہے۔ عجیب بات ہے نا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ مجھے یقین تھا' یہ ایسی ہی کوئی بات کہے گا۔" ثانیہ نے سوچا۔ "پچھلے چھ سال میں جس چہرے کو میں کبھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی' وہ تمہارا چہرہ تھا اور آج یہاں اس کمرے میں تمہیں دیکھنے کے بعد جس چہرے کو میں دوبارہ کبھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتی' وہ بھی تمہارا ہی چہرہ ہے۔ عجیب بات ہے نا۔"

اس نے سوچا تھا۔ اپنے اندازے کے صحیح ہونے پر اسے جیسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی تھی۔ وہ اب بھی بول رہا تھا۔ اسی پختہ اور سرد آواز میں۔

"میں لوگوں کو کبھی سمجھ نہیں سکتا اور عورت کو تو شاید بالکل بھی نہیں۔ میں نہیں جانتا' ہر ایک مجھے ہی دھوکا کیوں دینا چاہتا ہے۔ میں نے تو کبھی کسی کے لیے برا سوچا ہے' نہ برا چاہا۔ پھر بھی

......پھر بھی پتا نہیں لوگ میرے ساتھ یہ سب کیوں کرتے ہیں۔"

اپنی گود میں رکھے ہوئے دائیں ہاتھ کی پشت پر اس نے پانی کے چند قطرے گرتے دیکھے تھے اور پھر ہاتھ دھندلا گیا تھا۔ اس نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کی آواز اب بھی کمرے میں گونج رہی تھی۔

"تمہیں یہاں اس کمرے میں دیکھنے کے بعد مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں پھر وہیں پہنچ گیا ہوں' جہاں چھ سال پہلے کھڑا تھا۔"

"اور میں آج تک وہیں کھڑی ہوں' جہاں چھ سال پہلے تھی۔"

"چھ سال پہلے تم سے ملنے کے بعد میں نے سوچا تھا۔ دنیا میں ابھی بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو خودغرض نہیں ہیں۔ جنہیں دوسروں کی پروا ہے۔ چھ سال پہلے میں نے تمہیں آئیڈیلائز کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا مجھے زندگی میں تمہارے جیسا بننا ہے۔ آج یہاں اس کمرے میں بیٹھا میں سوچ رہا ہوں۔ کیا دنیا میں مجھ سے زیادہ بے وقوف کوئی اور ہوگا۔"

اس کی آواز میں رنجیدگی تھی۔ ثانیہ کے ہاتھ پر گرنے والے پانی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

"پانچ سال پہلے جب میں نے واپس جا کر تمہیں تلاش کرنے کی کوشش کی تھی اور مجھے پتا چلا تھا کہ تم مر چکی ہو تو میں بہت رویا تھا۔ مجھے لگا تھا ایک بار پھر میری دنیا ختم ہو گئی۔ آج تمہیں یہاں دیکھ کر لگ رہا ہے کہ دنیا تو آج ختم ہوئی ہے۔ میں نہیں جانتا' اس کمرے سے نکلنے کے بعد میں کیا کروں گا۔ میں دوبارہ کسی عورت پر اعتبار کر بھی پاؤں گا یا نہیں۔ تم تو بہت باتیں کیا کرتی تھیں۔ آج خاموش کیوں ہو' کچھ کہو۔"

وہ اب اس سے پوچھ رہا تھا۔

"تمہیں آنسوؤں جیسے ہتھیار کا سہارا لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم تو اس کے بغیر بھی دوسروں کو منہ کے بل گرانے میں ماہر ہو۔"

وہ شاید اس کے بہتے ہوئے آنسو دیکھ چکا تھا۔ ثانیہ نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ گالوں پر بہتے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔

"میں تمہاری زندگی کی پوری کہانی میں اپنا رول سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تمہارے لیے میں کیا تھا' ایک Filler ایک سپورٹ یا کچھ بھی نہیں ۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کو مجھ سے کیا چاہیے تھا۔ کون سی چیز تمہیں میری جانب کھینچ کر لائی تھی؟ تم نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا؟"

اس کے پاس سوالوں کا انبار تھا اور ثانیہ کے پاس جوابات نہیں تھے۔ اپنی گود میں رکھا ہوا بیگ اٹھا کر وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ اس کا ارادہ بھانپ گیا تھا۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" اس نے تیزی سے پوچھا تھا۔

کرسی دھکیل کر وہ دروازے کی طرف مڑ گئی تھی۔ وہ لپکتا ہوا [illegible] راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"میرے سوالوں کا جواب دیے بغیر تم کیسے جا سکتی ہو؟ تم اس طرح کیسے جا سکتی ہو؟"

وہ خاموش رہی تھی۔

"تم جانتی ہو' تم نے مجھے کتنا بڑا دھوکا دیا ہے؟" وہ اس کے بالکل سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔

ثانیہ نے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اس کی جیکٹ کے کالرز کو دیکھتی رہی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تم ایک بہت بڑا فراڈ ہو۔" اس نے جیکٹ کے بٹن گننے شروع کر دیے تھے۔ "اس طرح چپ رہ کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو تم؟ ڈرامہ کا کون سا ایکٹ رہ گیا ہے جسے اب پرفارم کرنا چاہتی ہو؟"

وہ بٹن گن چکی تھی۔ اب دوبارہ کالرز دیکھ رہی تھی۔

"کیا تم بول نہیں سکتی ہو؟" وہ اب چلا رہا تھا۔

اس نے اب شرٹ کے بٹن گننے شروع کر دیے تھے اور تب اچانک اس نے اپنے دائیں بازو پر اس کے ہاتھ کی گرفت محسوس کی تھی۔ وہ اسے جھنجوڑ رہا تھا۔ بے اختیار اس نے سختی سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹا دیا تھا۔

"مجھے ہاتھ مت لگاؤ حدید!" اس نے بالآخر اپنی خاموشی توڑ دی تھی۔ حدید کا چہرہ اس کے جملے پر سرخ ہو گیا تھا۔

"تمہارا وجود واقعی اتنا گندا ہے کہ میرے جیسے شخص کو ہاتھ تو کیا' اسے دیکھنا تک نہیں چاہیے۔"

ثانیہ نے ایک بار پھر سر جھکا لیا تھا۔

"آج ہاتھ لگانے پر اعتراض ہوا ہے' چھ سال پہلے تو......"

"چھ سال پہلے کا ذکر مت کرو۔ تب اور بات تھی۔" ثانیہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا۔

"میں جاننا چاہتا ہوں وہ "اور بات" کیا تھی۔ جس کے لیے تم نے مجھے استعمال کیا۔"

"آئی ایم سوری۔ اگر تم میری کسی بات سے کبھی ہرٹ ہوئے تو۔ اب میرا راستہ چھوڑ دو۔ مجھے جانا ہے۔"

وہ اس کی بات پر جیسے ہکا بکا رہ گیا تھا۔

"تمہارے لیے یہ سب کرنا کتنا آسان ہے۔ آئی ایم سوری۔ اگر تم میری کسی بات سے کبھی ہرٹ ہوئے تو۔ بس اتنا کہنا چاہیے تمہیں۔ "میں ہرٹ ہوا" تمہیں اندازہ ہے تم نے کیا کیا ہے۔ تم نے میری زندگی کے چھ سال برباد کر دیے ہیں اور تم صرف ایک جملہ بول کر سب کی تلافی کرنا چاہتی ہو' صرف ایک جملہ بول کر۔ تم کیسی انسان ہو؟ تم کیسی عورت ہو؟"

ثانیہ نے سر اٹھا کر پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ حدید کو اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے نظر آئے تھے۔

"میں نے کب کہا کہ میں انسان ہوں؟ میں نے کب کہا کہ میں عورت ہوں۔ میں تو تماشا ہوں۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ تماشا بننے اور دیکھنے کے لیے بڑی ہمت اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ دونوں چیزیں اللہ نے میرے مقدر میں لکھ دی ہیں۔ کچھ لوگوں کو اللہ دل آباد کرنے کے لیے بناتا ہے۔ کچھ کو زندگیاں برباد کرنے کے لیے۔ مجھے اللہ نے دوسرے کام کے لیے بنایا ہے۔ جو لوگ دوسروں کے دلوں کو کانٹوں سے زخمی کرتے ہیں' ان کے اپنے اندر کیکر اگے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ چاہیں یا نہ چاہیں' ان کے وجود کو کانٹا ہی بننا ہوتا ہے۔ وہ پھول نہیں بن سکتے۔ تم میرے لیے چھ سال روئے ہو۔ آج ایک بار اور رو لو' پھر سوچ لینا کہ میں واقعی مر گئی۔ ساری دنیا تمہارے آگے کھلی پڑی ہے۔ تمہارے لیے بھی کوئی نہ کوئی ہوگا۔ ہر عورت میرے جیسی نہیں ہوتی اور جو ہوتی ہے اسے...... اسے پھر حدید نہیں ملتا۔"

اس نے ایک بار پھر سر جھکا لیا تھا۔ حدید نے اپنی پشت پر دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ پروفیسر عبدالکریم اندر آ گئے تھے اور کمرے کے نظارے نے انہیں ہکا بکا کر دیا تھا۔ دونوں کے چہرے کے تاثرات اور ثانیہ کا بھیگا ہوا چہرہ انہیں پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔ ثانیہ بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ ان کی طرف بڑھی تھی۔

"میں آپ کی مشکور ہوں۔ آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا مگر ہم ہر بار اپنی قسمت نہیں بدل سکتے۔ آپ نے ہمیں جس کام کے لیے ملوایا تھا۔ وہ نہیں ہو سکتا پھر...... پھر بھی آپ کا شکریہ۔"

وہ کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

"زندگی اچھی چیز ہے۔ کیونکہ بس ایک بار ہی ملتی ہے۔ بار بار اس عذاب سے گزرنا نہیں پڑتا۔" اس نے باہر آ کر سوچا تھا۔ "اور میں اگر یہ بات پہلے جان جاتی کہ یہ تیسرا شخص حدید ہے تو شاید آج کی ملاقات کی نوبت ہی نہ آتی۔"

اسے خیال آیا۔ پروفیسر عبدالکریم نے اسے حدید کا نام بتایا تھا لیکن ان کی انگلش میں

عربی لہجہ اسے بہت سے لفظوں اور ناموں کی شناخت میں الجھن سے دوچار کر دیتا تھا۔ حدید کا نام بھی انہوں نے اس طرح لیا تھا کہ وہ نام کے صحیح اسپیلنگ اور تلفظ کے معاملے میں کنفیوزڈ ہی رہی تھی۔

اسلامک سینٹر سے باہر آنے کے بعد فٹ پاتھ پر چند قدم چلتے ہی اس نے اپنی پشت پر ایک شناسا آواز سنی تھی۔ وہ حدید تھا۔

"میں تم سے صرف ایک بات جاننا چاہتا ہوں' صرف ایک بات۔" وہ اس کے قریب آ گیا تھا۔ "چھ سال پہلے میرے پاس آنے کی وجہ میری محبت تو نہیں ہوگی۔ تمہیں کوئی اور چیز میرے پاس لائی تھی۔ محبت نہیں ...... ہے نا؟"

ثانیہ نے اسے دیکھا تھا اور پھر سر نفی میں ہلا دیا۔ پوری زندگی میں اس نے کبھی کسی کے چہرے کو دن کی روشنی میں اس طرح تاریک ہوتے نہیں دیکھا تھا' جس طرح حدید کا چہرہ ہوا تھا۔ وہ بالکل گم صم ہو گیا تھا۔

"اور مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ...... تم مجھے صرف ایک بار یہ بتا دو کہ تم میرے پاس کس لیے آئی تھیں۔ تمہیں کیا چاہیے تھا۔ پلیز مجھے بتا دو۔"

اس کے لہجے میں اب صرف افسردگی تھی' رنجیدگی تھی' التجا تھی۔ پہلے والا اشتعال ختم ہو چکا تھا۔ ثانیہ نے کچھ کہنا چاہا پھر سر جھکا لیا۔

ایمان اُمید اور محبت

سین 29

وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنے گالوں اور آنکھوں کو رگڑا۔ اسٹڈی کا دروازہ کھول کر وہ باہر آ گئی۔ پورے گھر میں تاریکی تھی۔ اسٹڈی کے علاوہ صرف ایک جگہ روشنی تھی اور وہ جگہ کچن تھی وہ جان گئی تھی' وہ کہاں موجود تھا۔ کچن میں جانے کے بجائے وہ بیڈروم میں چلی گئی۔ ڈریسنگ میں جا کر اس نے فرسٹ ایڈ کا سامان نکالا اور دھیمے قدموں کے ساتھ وہ کچن کی طرف آئی وہ کچن کے دروازے میں رک گئی۔

ڈائننگ ٹیبل کے اوپر لٹکنے والے لیمپ کی روشنی میں ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے ایمان کے علاوہ ہر چیز دھندلی نظر آ رہی تھی اس کا وجود اس روشنی میں بے حس و حرکت نظر آ رہا تھا' اور اس کے چہرے پر پڑنے والی رشنی چہرے پر موجود ہر تاثر کو واضح کر رہی تھی۔

تھکن ...... افسردگی ...... بے چینی ...... اضطراب ...... اور ...... امید ...... وہاں کیا تھا؟ وہاں کیا نہیں تھا؟

اس نے ''ایمان'' کو مجسم حالت میں دیکھا تھا۔ اسے رشک آیا تھا۔ وہ خوش قسمت تھا۔ اسے حسد ہوا وہ ''منتخب'' لوگوں میں سے تھا؟ اسے فخر ہوا' یہ خوش قسمت منتخب شخص اس کے مقدر میں تھا۔

وہ بے اختیار آگے بڑھ آئی۔ وہ آنکھیں بند کیے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ایمان علی کو اپنے چہرے پر ہاتھ کے لمس کا احساس ہوا' چند لمحوں کے لیے اس کا جسم تن گیا پھر جیسے سکون اور سرشاری کی ایک لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ بڑی نرمی اور ملائمت سے اس کا زخم صاف کر رہی تھی۔ اس کی کنپٹی سے نیچے بہنے والے خون کو روئی کے ساتھ گردن تک صاف کر رہی تھی۔ اب وہ زخم پر موجود بال کاٹ رہی تھی۔

ایمان یک دم ہی جیسے بہت پرسکون ہو گیا تھا۔ سر میں ہونے والی تکلیف ختم ہو گئی تھی۔ ہر تکلیف ختم ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں کے لمس میں جادو تھا۔ وہ اس کی بینڈیج کر چکی تھی مگر اب بھی اسی طرح اس کے سر پر ہاتھ رکھے پاس کھڑی تھی۔

چند لمحے اور گزرے پھر اس نے اپنے گال پر پانی کے چند قطرے گرتے محسوس کیے۔ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ جانتا تھا یہ پانی نہیں تھا۔ آنسو تھے ...... اپنے آنسو کسی دوسرے کے گال پر بہنے لگیں تو کیا ہوتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔

''کیا امید کی آنکھوں میں آنسو آ سکتے ہیں؟'' آنکھیں اسی طرح بند کیے اس نے مدھم آواز میں پوچھا۔

''ایمان کے لیے آ سکتے ہیں۔'' اس نے بھی اسی طرح سرگوشی میں کہا۔

''اور ''محبت'' کے لیے؟'' امید نے اسے کہتے سنا۔

''اب نہیں ......'' وہ کیا پوچھ رہا تھا' وہ جانتی تھی۔ وہ خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر نظر جمائے وہ ہر نقش کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل کے سامنے کھلی کھڑکی سے تیز ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا۔ ڈائننگ ٹیبل کے اوپر لٹکنے والا آرائشی لیمپ فضا میں لہرانے لگا۔

وہ اس کے چہرے پر لہراتی تیز اور مدھم ہوتی ہوئی روشنی کو دیکھنے لگی۔ لیمپ آہستہ آہستہ جھول رہا تھا۔ خاموشی اور روشنی عجیب سے رقص میں مگن تھیں۔ وہ اس کے بالوں میں سے آہستہ آہستہ ہاتھ اس کے ماتھے پر لے آئی پھر ہاتھ کی ہتھیلی سے اس نے ایمان کی آنکھیں ڈھک دیں' ایمان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری یوں جیسے وہ اس کے ہاتھ کی حرکت سے محظوظ ہوا ہو' وہ اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے۔ چہرہ دیکھتی رہی یوں جیسے اس کی آنکھوں کو روشنی کے لہراتے سایوں سے بچانا چاہتی ہو۔ جیسے سکون دینا چاہتی ہو' وہ گہرے سانس لیتا ہوا بے حد پرسکون نظر آ رہا تھا۔

تیز ہوا کے کچھ اور جھونکے اندر آئے' اس نے ہوا میں گرد محسوس کر لی تھی۔ آندھی آ رہی تھی۔ اس بار اس نے ہر کھڑکی' ہر دروازہ بند کرنا تھا اس بار وہ کسی بھی چیز کو آلودہ ہونے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اپنے اردگرد موجود ہر چیز اسے یک دم جیسے بہت قیمتی لگنے لگی تھی۔ وہ ہاتھ ہٹا کر بہت تیزی سے کھڑکی کی طرف گئی۔ ایمان نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ وہ کھڑکی بند کر رہی تھی۔ ہوا میں یک دم شدت اور تیزی آ گئی۔ اسے دقت ہو رہی تھی' ایمان بے اختیار اٹھ کر اس کی طرف گیا۔ کھڑکی کا پٹ کھینچ کر ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ باہر لان میں سے اٹھنے والا ہوا کا ایک بگولا اپنے ساتھ لیے ہوئے پتوں اور مٹی کے ساتھ کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرایا۔ مٹی اندر نہیں آ سکی' کھڑکی کے شیشوں سے مٹی اور پتے ٹکراتے ہوئے نیچے گر رہے تھے۔

امید نم آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے سحر زدہ سی کھڑکی سے ٹکرانے والے پتوں اور مٹی کو دیکھ رہی تھی وہ یک دم خود کو بہت محفوظ محسوس کرنے لگی تھی۔

''باہر سے آنے والی گندگی اندر نہیں آ سکی ...... اس بار کوئی آلودگی اندر آ ہی نہیں سکتی۔ اس بار ''ایمان'' اور ''امید'' ایک ساتھ کھڑے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سوچا ایمان برق

رفتاری سے کچن کی دوسری کھڑکیاں بند کر رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا اور وہیں کھڑی رہی۔

"مجھے یہ موسم پسند نہیں ہے' اتنی مٹی' ہر وقت کا طوفان ...... اب پھر صبح سارا گھر صاف کرنا پڑے گا۔"

"سارا دن ضائع کرے گا صابر ...... میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کھڑکیاں کیسے کھلی رہنے دیں۔ پتا نہیں کس کس کمرے کی کھلی ہوں گی۔ اور پتا نہیں کہاں کہاں سے مٹی اندر آ رہی ہو گی۔" وہ اب بولتے ہوئے کچن سے نکل رہا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے پیچھے کچن سے نکلتے ہوئے اس نے سوچا۔

"ایمان کے شیشے پر کتنی ہی گرد اور مٹی کیوں نہ ہو۔ اسے صاف کیا جا سکتا ہے۔ بس صرف ایک ہاتھ پھیرنا پڑتا ہے اور شیشے میں سے عکس نظر آنا شروع ہو جاتا ہے اور پھر ہر ہاتھ کے ساتھ عکس پہلے سے زیادہ صاف اور چمکدار ہوتا جاتا ہے ...... اور وہ ہاتھ اس محبت کا ہوتا ہے جو ایمان سے ہوتی ہے۔"

لاحاصل

سین 30

اس نے بارش کی آواز کو تیز ہوتے سنا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب بند کر دی۔ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا سر اٹھا کر اس نے لکڑی اور گارے سے بنی ہوئی چھت کا وہ کونہ دیکھا جو ہر سال کی طرح اس بار بھی رسنا شروع ہو چکا تھا۔

"اور اب اس کے نیچے رکھا جائے گا' ایک عدد برتن ...... اور اس برتن میں گرتی ہوئی بوندوں کی بھیانک آواز ساری رات مجھے سونے نہیں دے گی۔" وہ بڑبڑائی۔

اپنی چارپائی پر گود میں کتاب لئے دانتوں سے بائیں ہاتھ کے ناخن کترتے ہوئے وہ بہت زیادہ بے چین لگ رہی تھی۔ کمرے کے کھلے دروازے سے اب صرف بارش کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ماما جان کے تیز قدموں کے ساتھ صحن سے چیزیں اٹھا اٹھا کر برآمدے میں رکھنے اور پھر ان ہی قدموں کے ساتھ واپس صحن میں جانے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

بارش جب برسنا شروع ہوئی' اس وقت ماما جان کمرے میں نماز پڑھنے میں مصروف تھیں اور نماز سے فارغ ہوتے ہوتے بارش بہت تیز ہو چکی تھی۔ دعا سے فارغ ہوتے ہی جائے نماز اٹھانے کے بجائے وہ تقریباً بھاگتی ہوئی باہر صحن میں گئیں اور چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں۔ مریم ڈھیلوں کی طرح کتاب کھولے بیٹھی رہی۔ ماما جان نے اسے چیزیں اٹھانے کے لئے نہیں بلایا تھا۔

اب کتاب بند کیے وہ تلخی سے سوچ رہی تھی۔

"یہ سب ماما جان کی اپنی چوائس ہے پھر ان کی مدد کیوں کی جائے انہیں سب کچھ خود ہی سمیٹنا چاہیے' کم از کم انہیں یہ احساس تو ہو گا کہ یہ سب کچھ کتنا ڈراؤنا ہے ...... مگر ماما جان کو یہ احساس کبھی نہیں ہو سکتا۔"

اس نے ایک گہرا سانس لے کر اپنے چٹختے ہوئے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"اب یہ بارش برستی رہے گی اور چند گھنٹوں کے بعد صحن میں گلی کا گندا پانی آ جائے گا۔ اتنا پانی کہ ہم برآمدے سے صحن کے دروازے تک بھی نہیں جا سکیں گے۔ جب تک اس گندے پانی میں پاؤں نہ دھر لیں ...... اور پھر ہم جیسے گھر کے بجائے ایک جزیرے پر بیٹھے ہوں گے' خشکی کے انتظار میں۔

کب بارش رکے، کب پانی ڈھلے، کب گارے سے کیچڑ میں تبدیل ہو جانے والے صحن کی وہ اینٹیں نظر آئیں جو پندرہ فٹ لمبے صحن کے بیرونی دروازے اور برآمدے کو آپس میں ملاتی ہیں اور جن کے بغیر بارش کے بعد صحن کے کیچڑ میں سے گزر کر جانا ناممکن ہے اور یہ سب کچھ میرا مقدر آپ نے بنایا ہے ماما جان ...... ورنہ میں اس سب کے لائق تو نہیں ہوں۔" اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری۔

"برآمدے میں سے اب اس بکرے کی آواز سنائی دے رہی تھی جسے سال کے شروع میں خریدا جاتا تھا۔ اور پھر پورا سال پالنے کے بعد قربانی دی جاتی تھی۔ وہ ان تمام بکروں کی گندگی اور آوازوں سے تنگ آ چکی تھی، جنہیں ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک ہر سال وہ دیکھتی آ رہی تھی، بچپن میں اسے وہ اچھے لگتے تھے وہ ان کے ساتھ کھیلتی تھی۔ شعور سنبھالنے کے بعد اسے ان سے نفرت ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ان بکروں کا رنگ بدل جاتا تھا مگر اسے ان کی آواز ہمیشہ پہلے جتنی ہی بھیانک لگتی۔

اب اسے ان مرغیوں کی آواز سنائی دینے لگی تھی جو اس کے گھر کا ایک اور بنیادی جز تھیں۔ وہ انہیں برداشت کر لیتی تھی اسے ان سے بکرے جتنی نفرت نہیں تھی۔ مگر نفرت تھی اور برداشت کرنے کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً ان کے انڈے استعمال کیا کرتی تھی اور کبھی کبھار گوشت بھی۔ اس کی واحد عیاشی ...... doctrine of necessity ...... (نظریہ ضرورت)۔

وہ زندگی میں جس چیز کو بھی استعمال کے قابل پاتی، اس کی خامیوں کو نظر انداز کر دیتی تھی۔

ابھی تک اسے اس بلی کی آواز سنائی نہیں دی تھی، جو اس کے گھر کا ایک اور اہم حصہ تھی۔ بکرے کی طرح اسے اس بلی سے بھی نفرت تھی کیونکہ وہ بکرے کی طرح اسے بھی بوجھ سمجھتی تھی۔ بعض دفعہ اسے یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ اسے کس سے زیادہ نفرت تھی، بکرے سے یا بلی سے ...... کون اس گھر پر زیادہ بوجھ تھا۔ بکرا سال میں کم از کم ایک بار تو کام آ جاتا تھا اور بلی ...... کبھی نہیں۔ اسے یاد تھا وہ کب آئی تھی اور اس سے پہلے کتنی بلیاں اس گھر میں رہ چکی تھیں۔ ہر بلی کے مرنے کے کچھ عرصہ کے بعد کوئی نہ کوئی دوسری بلی خودبخود ہی وہاں آ جاتی اور ماما جان ...... اسے غصہ آنے لگا۔ اسے یاد آیا، پچھلی بلی کی وجہ سے وہ کتنی ٹینس رہی تھی۔ وہ گلی میں سے گزرتے ہوئے کسی موٹر سائیکل سے ٹکرا گئی اور اس کا پچھلا دھڑ مفلوج ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے کسی دوسری جگہ جانے کے قابل بھی نہیں رہی تھی، زیادہ سے زیادہ چند قدم رینگتی پھر جیسے اس کی ہمت جواب دے جاتی۔ ماما جان نے اس سے چھٹکارا پانے کے بجائے کسی شیرخوار بچہ کی طرح اس کی دیکھ بھال شروع کر دی تھی۔ مریم کو متلی ہونے لگتی جب وہ ماما جان کو اس بلی کی گندگی صاف کرتے دیکھتی۔

اسے حیرت ہوتی۔ ماما جان کو گھن کیوں نہیں آتی۔ بلی دن میں جتنی بار گندگی پھیلاتی، ماما جان اتنی بار ہی اسے صاف کرتیں۔ گرم پانی سے اسے نہلایا جاتا۔ اس کے پچھلے دھڑ کی مالش کی جاتی۔ مریم کا دل چاہتا، وہ بلی کو اٹھا کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دے۔ ایک سال تک اس بلی کی اسی طرح دیکھ بھال ہوتی رہی پھر ایک دن وہ بلی مر گئی۔ اس دن ماما جان نے سارا دن کچھ نہیں کھایا۔ مریم نے خاص طور پر اس دن کھانا پکایا ...... وہ بہت خوش تھی بلی سے جان چھوٹ گئی۔

دو ہفتوں کے بعد ایک صبح پھر اس نے ماما جان کے پاس بلی کا ایک بچہ دیکھا اور اس کا جی چاہا وہ اپنا سر پیٹ لے۔ پچھلے بہت سے سالوں سے ایسا ہی ہوتا رہا تھا، ماما جان ایک بار پھر خوش تھیں یوں جیسے ان کے گھر کا کوئی فرد واپس آ گیا ہو۔

"ہاں ...... ماما جان کے پالتو ...... میں، بکرا، مرغیاں اور بلی۔" وہ کہتے ہوئے ایک بار پھر تلخی سے مسکرائی۔ اور ان سب میں سے ماما جان کے نزدیک سب سے کم اہمیت کس کی ہے؟ مریم کی۔" وہ ایک بار پھر بڑبڑائی۔ سارا سال ان جانوروں کی جگہ بدلتی رہتی تھی۔ گرمیوں میں وہ صحن میں ہوتے، برسات میں برآمدے میں اور سردیوں کی راتوں کو اسی کمرے میں ...... بعض دفعہ مریم کا دل چاہتا، وہ وہاں سے بھاگ جائے۔ ایک چھوٹے سے کمرے، برآمدے، غسل خانے اور صحن پر مشتمل اس تین مرلہ گھر سے اسے وحشت ہوتی تھی۔ جہاں کچھ بھی نہیں تھا نہ فریج، نہ ٹی وی، نہ ہیٹر، گیزر ...... کچھ بھی نہیں ...... بعض دفعہ جب وہ ماما جان سے الجھ رہی ہوتی تو کہتی۔

"آپ نے بجلی کیسے لگوالی۔ مجھے حیرت ہے، اس کے بغیر بھی تو گزارہ ہو سکتا تھا۔ دیئے استعمال کر سکتے ہیں، لالٹینیں جلائی جا سکتی ہیں یا پھر مشعلیں روشن کر کے دیواروں پر ٹانگی جا سکتی ہیں۔"

ماما جان خاموشی اور سکون کے ساتھ اس کی بات سنتی رہتیں۔ اسے ان کی خاموشی سے چڑ تھی اور سکون سے نفرت ...... اس کا خیال تھا یہ وہ ہتھیار تھے جو وہ صرف اسے زیر کرنے کے لئے استعمال کرتی تھیں۔

بارش مسلسل تیز ہوتی جا رہی تھی۔ مریم کا غصہ اور بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے ہر موسم کی بارش سے نفرت تھی مگر برسات کی بارش ...... اس کا دل چاہتا، اس موسم میں وہ کسی صحرا میں جا بیٹھے جہاں پانی کا ایک قطرہ تک نہ ہو۔ چاہے پینے کے لئے بھی پانی نہ ملے۔ مگر بس پانی نہ ہو۔

اس موسم میں کیچڑ بھرے صحن اور پھر اس محلے کی گلیوں سے گزر کر جانا اس کے لئے سب سے اذیت ناک کام ہوتا تھا۔ وہ کسی طرح بھی اپنے کپڑوں کو کیچڑ یا گندے پانی کے چھینٹوں سے بچائے بغیر وہاں سے نہیں گزر سکتی تھی اور گندے کپڑوں کے ساتھ اس کالج جانا جہاں وہ پڑھتی تھی، اس کے لئے ڈوب مرنے کے برابر تھا۔ اس کے پاس اس کا ایک ہی حل ہوتا تھا جس دن بارش

ہوتی وہ کالج نہ جاتی۔ بعض دفعہ لگا تار کئی کئی دن بارش ہوتی رہتی اور پھر اسے دل پر جبر کرتے ہوئے کالج جانا ہی پڑتا تھا اور تب اپنے پائنچوں اور شرٹ کے دامن پر لگے ہوئے کیچڑ پر پڑنے والی نظریں دیکھ کر اس کا دل زمین میں زندہ گڑ جانے کو چاہتا۔ لباس اچھا اور قیمتی ہو تب بھی کیچڑ کا دھبہ لباس کو بے قیمت کر دیتا ہے اور لباس سستا اور بھدا ہو تو پھر اس پر کیچڑ کا دھبہ لباس کو بے قیمت نہیں کرتا...... پہننے والے کو بے وقعت کر دیتا ہے۔

اس نے ماما جان کو کمرے میں آتے دیکھا اور ایک بار پھر کتاب کھول کر چہرے کے سامنے کر لی۔ وہ پوری طرح شرابور تھیں۔ ان کے کپڑے جسم سے چپکے ہوئے ان کے کمزور جسم کی ہڈیوں کو بہت نمایاں کر رہے تھے۔ انہوں نے نماز کے لیے اپنے سر اور جسم کے گرد لپٹی ہوئی چادر اتاری اور چادر کو چارپائی پر سوکھنے کے لئے پھیلا دیا۔ اس کے بعد وہ جائے نماز اٹھا کر تہہ کرنے لگی تھیں۔ مریم نے کن اکھیوں سے انہیں دیکھا۔ وہ جائے نماز رکھتے ہوئے کمرے کے ایک کونے کی چھت کو دیکھ رہی تھیں جو خلاف معمول اس سال برسات میں نہیں رس رہا تھا۔ اور پھر ان کے چہرے پر جیسے ایک فخریہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اس بار اس کونے سے پانی نہیں ٹپک رہا۔ بارشوں کو شروع ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں پھر بھی یہ حصّہ پہلے کی طرح خشک ہے۔" انہوں نے پلٹ کر مریم سے کہا۔

"ہاں۔ اس بار آپ نے کنکریٹ جو بچھا دیا ہے ساری چھت پر...... بھلا چھت ٹپکنے کی ہمت کیسے کر سکتی ہے۔"

مریم نے چھت کے دوسرے ٹپکتے ہوئے کونے کو دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا اور دوبارہ اپنی نظریں کتاب پر جما دیں۔ ماما جان اس کی بات پر کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گئیں اور تھوڑی دیر بعد وہ کمرے کے اندر مٹی کا ایک پیالہ لے کر آئی تھیں جسے انہوں نے چھت سے رسنے والے ان قطروں کے عین نیچے رکھ دیا۔ ہر بار برسات آنے سے پہلے ماما جان چھت کی لپائی کرتی تھیں۔ کئی سال پرانا یہ گھر اور اس کی چھت آہستہ آہستہ بوسیدہ ہوتے جا رہے تھے چھت اب کئی سالوں سے مسلسل ہر سال برسات کے موسم میں ٹپکتی تھی اور ماما جان اب پچھلے تین سالوں سے چھت کو مزید کسی نقصان سے بچانے کے لئے اس پر گارے کی لپائی کرنے سے پہلے پلاسٹک کی ایک شفاف شیٹ اس پر بچھا دیتیں اور پھر اس شیٹ کے اوپر گارے کی لپائی کرتی تھیں۔ اب تک چھت پر تین سالوں میں تین شیٹوں کا اضافہ ہو چکا تھا مگر پھر بھی بارش کا پانی کسی نہ کسی طرح راستہ بنا ہی لیتا اس بار البتہ صرف ایک کونہ ہی رس رہا تھا۔

برسات سے پہلے ہر سال گھر میں ہونے والا یہ تعمیراتی کام بھی اسے ناپسند تھا کیونکہ ماما جان صحن کے بیچوں بیچ کئی دن گارے اور مٹی کا کیچڑ ہاتھوں اور پیروں سے گوندھتی رہتی تھیں۔ ان

دنوں ان کے ہاتھ اور پاؤں کہنیوں اور گھٹنوں سے کچھ نیچے ہر وقت کیچڑ سے لتھڑے رہتے تھے۔ مریم کو یہ کیچڑ دیکھ دیکھ کر گھن آتی رہتی تھی۔ ان دنوں مما جان اگر اپنے ہاتھ پاؤں اچھی طرح دھونے کے بعد بھی اس کے لئے روٹیاں پکانے کی کوشش کرتیں تو وہ کبھی کھانے پر تیار نہ ہوتی...... اسے تب ان کے صاف ہاتھ بھی گندے ہی لگتے تھے۔ ماما جان کو اس کی اس ناپسندیدگی کا پتہ تھا اس لئے ان دنوں وہ خود اس کے لئے روٹی پکانے کے بجائے بازار سے روٹی منگوا لیا کرتی تھیں۔

کمرے میں چلتا ہوا پنکھا اپنی کئی سال پرانی مخصوص آواز کے ساتھ اس کے اشتعال کو اور ہوا دے رہا تھا۔ اسے بچپن سے اس "باآواز" پنکھے کی اتنی عادت پڑ چکی تھی کہ اس کا خیال تھا اب اگر اسے کسی ایسے کمرے میں سونا پڑے جہاں چلتا ہوا پنکھا بے آواز ہو تو اسے نیند نہیں آئے گی۔

"میرے لئے کبھی کوئی ائر کنڈیشنر نہیں ہوگا' صرف یہ بے ہودہ اور گھٹیا پنکھا ہی ہوگا۔"

اس نے پنکھے پر نظریں جماتے ہوئے ایک بار پھر کڑھ کر سوچا تھا۔ بہت دفعہ ماما جان سے جھگڑے کے بعد اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی وقت چلتا ہوا یہ پنکھا ہی اس کے اوپر گر پڑے' کم از کم تو اس کا کوئی فائدہ اس کو خوش کر جائے۔

"No comforts, no luxuries - just contentment. To hell with your contentment Mama Jaan"

"نہ آسائشات' نہ تعیشات محض قناعت۔ جہنم میں جائے آپ کی یہ قناعت...... ماما جان" وہ زہریلے لہجے میں بڑبڑائی۔

"انسان ٹوٹی دیواروں' اکھڑے فرش' رستی ہوئی چھت' چار چھ جانوروں' دس بارہ پودوں اور خواہشوں کی قبروں کے ساتھ کتنی دیر "خوش" رہ سکتا ہے بلکہ کتنی دیر رہ سکتا ہے اور آخر انسان رہے کیوں؟ اگر اس کے پاس بہتر مواقع ہیں تو کیوں ان کا فائدہ نہ اٹھائے مگر ماما جان...... ماما جان تو یہ سب کچھ کبھی سننا ہی نہیں چاہیں گی...... لیکن اگر وہ کنویں کا مینڈک بن گئی ہیں تو میں بھی کنویں کا مینڈک کیوں بنوں۔ انہوں نے اپنی زندگی گزار لی ہے اور مجھے اپنی زندگی گزارنی ہے۔ اگر ان کا یہ خیال ہے کہ میں اس گھر میں ان کی طرح جانوروں اور پودوں کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ تو وہ غلط سوچ رہی ہیں...... یہ گھر میری منزل نہیں ہے' کم از کم میں یہاں تو زندگی نہیں گزار سکتی۔" اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو پا رہا تھا۔ "ان گندے لوگوں کے درمیان میں تو زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں تو ان میں سے نہیں ہوں۔" بہت دفعہ کا سوچا ہوا جملہ ایک بار پھر اس کے دماغ میں گونجا تھا۔ "کتنی دیر باندھ کر رکھ سکتی ہیں ماما جان مجھے...... ایک نہ ایک دن تو میں یہاں سے بھاگ جاؤں گی۔ مجھے ماما جان کی طرح اپنی زندگی یہاں برباد نہیں کرنی۔" وہ بے چینی کے عالم میں ایک

بار پھر اپنے ناخن کترنے لگی۔

ماما جان ایک بار پھر کمرے میں آ چکی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر کتاب چہرے کے آگے کر لی۔ وہ اب خشک کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ کمرے میں آنے کے بعد انہوں نے کمرے میں پھیلی ہوئی چیزوں کو سمیٹنا شروع کر دیا اور یہ پھیلی ہوئی چیزیں صرف مریم ہی کی ملکیت تھیں۔ اس کا ایزل، پے لٹ، کلر برش، کتابیں، کلرز سب کچھ ہمیشہ کی طرح کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ صبح سے کمرے میں پینٹنگ کر رہی تھی اور جو چیز اس نے جہاں رکھی تھی کام کے بعد بھی وہیں چھوڑ دی تھی۔ اس کی یہ عادت بھی نئی نہیں تھی ہمیشہ ماما جان ہی اس کی ادھر اُدھر پھینکی اور پھیلائی ہوئی چیزوں کو سمیٹتی رہتی تھیں۔ اسے یہ چیز بھی کبھی احسان یا مدد نہیں لگی تھی، وہ اسے بھی ہمیشہ حق سمجھ کر کروایا کرتی تھی۔

"جتنی تکلیف وہ زندگی میں ماما جان کی وجہ سے گزار رہی ہوں اگر اس کی تلافی کے لئے وہ یہ چھوٹی موٹی عنایات مجھ پر کر دیتی ہیں تو کوئی احسان نہیں کرتیں۔ وہ اگر میری بات مان لیں تو انہیں کبھی میرے لئے یہ ساری زحمتیں نہ اٹھانا پڑیں کیونکہ پھر میں انہیں اس طرح کے کاموں کا کوئی موقع ہی نہیں دوں گی لیکن ماما جان وہ اگر اپنی ضد پر قائم ہیں تو پھر ٹھیک ہے، میں بھی انہیں تکلیف کیوں نہ پہنچاؤں۔ اٹھاتی پھریں یہ ساری چیزیں۔"

وہ بہت زیادہ مشتعل ہو کر سوچ رہی تھی۔

"تم نے چائے نہیں پی؟" وہ چیزیں سمیٹتے سمیٹتے اس کی تپائی کے پاس آئیں اور تب ہی ان کی نظر تپائی پر رکھے ہوئے چائے کے کپ پر پڑی جس پر اب بالائی کی تہہ جم چکی تھی۔

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے چائے نہیں پینی۔ آپ پھر بھی کپ یہاں رکھ گئی تھیں۔" اس نے کتاب پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں چائے اس لئے دی تھی کیونکہ تم نے کھانا نہیں کھایا۔" انہوں نے اس کی کتابیں تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اب بھی کھانا کھاؤں گی بھی نہیں۔ کم از کم اس گھر سے نہیں۔"

"ضد کیوں کر رہی ہو مریم؟" وہ اس کے قریب بستر پر بیٹھ گئیں۔

"میں ضد نہیں کر رہی۔ آپ ضد کر رہی ہیں۔" اس نے ایک جھٹکے سے کتاب بند کر دی۔

"میں جو کچھ کر رہی ہوں۔ تمہارے فائدے کے لئے کر رہی ہوں۔"

"پلیز ماما جان! آپ یہ جملہ مت بولا کریں۔ آپ میرا فائدہ مت چاہیں۔ مجھے اپنی زندگی اپنے طریقے سے گزارنے دیں۔ میری خوشیوں کے راستے میں رکاوٹ نہ بنیں۔" اس نے

بے زاری سے کہا۔

"میں تمہارے لئے رکاوٹ نہیں بن رہی ہوں، میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

"اگر آپ کو میری اتنی پرواہ ہوتی ماما جان! تو میں یہاں دھکے نہ کھا رہی ہوتی۔ آپ مجھے لے کر انگلینڈ چلی جاتیں۔ میرا کوئی مستقبل ہوتا وہاں۔ میں آج وہاں ایک بڑا نام ہوتی مگر آپ نے یہ سب نہیں کیا۔ آپ نے ہمیشہ ضد کی، اپنی من مانی کی، آپ نے مجھے ہر چیز کے لئے ترسا دیا، ہر سہولت کے لئے خوار کیا اور اب آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ آپ چاہتی ہیں کہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے؟ میری زندگی میں اگر کوئی سہولت یا لگژری آ جائے گی تو مجھے نقصان پہنچے گا؟ مجھے شہرت مل جائے گی تو مجھے نقصان پہنچے گا؟ میں اپنے نام سے پہچانی جاؤں گی تو مجھے نقصان پہنچے گا؟ میرا کام سراہا جائے گا تو مجھے نقصان پہنچے گا؟ میرا مستقبل محفوظ ہو جائے گا تو مجھے نقصان پہنچے گا؟"

ماما جان خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہیں۔

"چائے اور بنا دوں؟"

اپنی بات کے جواب میں ان کے منہ سے نکلنے والے جملے نے اسے اور بھڑکایا۔ "ماما جان! آپ میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہی ہیں۔ آپ میری زندگی کو اپنے طریقے سے چلانے کی کوشش نہ کریں۔ اپنے اصولوں کو میرے سر پر مت تھوپیں۔" وہ اس کے پاس سے اٹھ گئیں۔

"آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے ماما جان! آپ کو مجھ سے محبت ہوتی تو آپ میری بات مان لیتیں مگر آپ......"

وہ خاموش ہو گئی۔ ماما جان اس کی بات سنے بغیر کمرے سے باہر جا چکی تھیں۔

پیرِ کامل

سین 31

ساتویں منزل پر اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بھی اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا وہ کہیں اور جانا چاہتا تھا۔ کہاں......؟

اس نے اپارٹمنٹ کے دروازے کو لاک کیا۔ لاؤنج میں پڑے ٹی وی کو آن کیا۔ سی این این پر نیوز بلیٹن آ رہا تھا۔ اس نے اپنے جوتے اور جیکٹ اُتار کر دور پھینک دیے۔ پھر ریموٹ لے کر صوفے پر لیٹ گیا۔ خالی الذہنی کے عالم میں وہ چینل بدلتا رہا۔ ایک چینل سے گونجتی اردو آواز نے اسے روک لیا۔ ایک غیر معروف سا گلوکار کوئی غزل گا رہا تھا۔

میری زندگی تو فراق ہے، وہ ازل سے دل میں مکیں سہی
وہ نگاہِ شوق سے دور ہیں، رگِ جاں سے لاکھ قریں سہی

اس نے ریموٹ اپنے سینے پر رکھ دیا۔ گلوکار کی آواز بہت خوب صورت تھی یا پھر شاید وہ اس کے جذبات کو الفاظ دے رہا تھا۔

ہمیں جان دینی ہے ایک دن، وہ کسی طرح وہ کہیں سہی
ہمیں آپ کھینچئے دار پر جو نہیں کوئی تو ہمیں سہی

شاعری، کلاسیکل میوزک، پرانی فلمیں، انسٹرومینٹل میوزک اسے ان تمام چیزوں کی worth کا اندازہ پچھلے کچھ سالوں میں ہی ہونا شروع ہوا تھا۔ پچھلے کچھ سالوں نے اس کی موسیقی کے انتخاب کو بہت اعلیٰ کر دیا تھا ورنہ اردو غزلیں سننے کا تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

سرِ طور ہو، سرِ حشر ہو، ہمیں انتظار قبول ہے
وہ کبھی ملیں، وہ کہیں ملیں، وہ کبھی سہی، وہ کہیں سہی

اسے ایک بار پھر امامہ یاد آئی۔ اسے ہمیشہ وہی یاد آتی تھی۔ پہلے وہ صرف تنہائی میں یاد آتی تھی پھر وہ ہجوم میں بھی نظر آنے لگی...... اور وہ۔ وہ محبت کو پچھتاوا سمجھتا رہا۔

نہ ہو ان پہ جو مرا بس نہیں کہ یہ عاشقی ہے ہوس نہیں
میں ان ہی کا تھا، میں ان ہی کا ہوں، وہ میرے نہیں تو نہیں سہی

سالار یک دم صوفے سے اُٹھ کر کھڑکیوں کی طرف چلا گیا۔ ساتویں منزل پر کھڑے وہ رات کو روشنیوں کی اوٹ میں دیکھ سکتا تھا۔ عجب وحشت تھی جو باہر تھی۔ عجب عالم تھا جو اندر تھا۔

جو ہو فیصلہ وہ سنائیے اسے حشر پر نہ اُٹھائیے
جو کریں گے آپ ستم وہاں، وہ ابھی سہی، وہ یہیں سہی

وہاں کھڑے کھڑکیوں کے شیشوں کے پار اندھیرے میں ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے اندر اُترنے کی کوشش کی۔

''میں اور کبھی کسی لڑکی سے محبت کروں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

بہت سال پہلے اکثر کہا جانے والا جملہ اسے یاد آیا۔ باہر تاریکی کچھ اور بڑھی۔ اندر آوازوں کی بازگشت...... اس نے شکست خوردہ انداز میں سر جھکایا پھر چند لمحوں کے بعد دوبارہ سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ انسان کا اختیار کہاں سے شروع کہاں پر ختم ہوتا ہے؟ ڈپریشن کا ایک اور دورہ، باہر نظر آنے والی ٹمٹماتی روشنیاں بھی اب بجھنے لگی تھیں۔

اسے دیکھنے کی جو لو لگی تو نصیر دیکھ ہی لیں گے ہم
وہ ہزار آنکھ سے دور ہو، وہ ہزار پردہ نشیں سہی

سالار سکندر نے مڑ کر اس کی اسکرین کو دیکھا، گلوکار لہک لہک کر بار بار آخری شعر دہرا رہا تھا۔ کسی معمول کی طرح چلتا ہوا وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ سینٹر ٹیبل پر رکھے ہوئے بریف کیس کو کھول کر اس نے اندر سے لیپ ٹاپ نکال لیا۔

اسے دیکھنے کی جو لو لگی تو نصیر دیکھ ہی لیں گے ہم
وہ ہزار آنکھ سے دور ہو، وہ ہزار پردہ نشیں سہی

گلوکار مقطع دہرا رہا تھا۔ سالار کی انگلیاں لیپ ٹاپ پر برق رفتاری سے حرکت کرتے ہوئے استعفیٰ لکھنے میں مصروف تھیں۔ کمرے میں موسیقی کی آواز اب ڈوبتی جا رہی تھیں۔ استعفیٰ کی ہر لائن اس کے وجود پر چھائے جمود کو ختم کرتی جا رہی تھی وہ جیسے کسی جادو کے حصار سے باہر آ رہا تھا۔ کوئی توڑ ہو رہا تھا۔

ایمان اُمید اور محبت

سین 32

وہ ایک بار پھر چلنے لگی تھی۔ اس کے پاس رکنے والی گاڑی فراٹے کے ساتھ اس کے پاس سے گزر گئی تھی۔ اس کی اداسی یکدم بے حد گہری ہوگئی تھی۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے درخت کی نچلی شاخ پر اس نے پرندوں کا ایک جوڑا بیٹھے دیکھا تھا۔

"One for sorrow two for joy."

اس نے زیرلب کہا تھا۔

"Joy؟" ایک تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھری تھی۔ بارش یکدم تیز ہوگئی تھی۔

وہ مین روڈ پر پہنچنے کے لیے تیزی سے چلنے لگی۔

بس شیلٹر کے نیچے پہنچ کر وہ سوچنے لگی تھی کہ اسے اس وقت کہاں جانا چاہیے۔ وہ گھر جانا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم آج کے دن وہ گھر جا کر کمرے میں قید ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے دور سے بس کو آتا دیکھ لیا تھا۔

ایک سستے سے انڈین ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر اس نے کھانا کھایا تھا اور پھر پہلے کی طرح سڑکوں پر بے مقصد بارش میں بھیگنے کے بجائے وہ ایک شاپنگ مال میں گھس گئی تھی۔ مختلف چیزوں اور لوگوں پر نظر دوڑاتے ہوئے بہت دیر تک وہ ادھر سے ادھر پھرتی رہی تھی۔ اسے یاد آیا تھا۔ پچھلی عید پر بھی وہ یہاں اسی طرح پھرتی رہی تھی۔

"اگلے کتنے سال میں اپنی عیدیں اس طرح گزاروں گی؟" شاپنگ مال میں کافی پیتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ "یہاں اس طرح اکیلے پاگلوں کی طرح پھرتے ہوئے۔"

اسے اندازہ نہیں ہوا۔ اس نے وہاں کتنے گھنٹے گزارے تھے۔ جب وہ شاپنگ مال سے نکلی تھی تو آسمان تاریک تھا۔ بارش اب بھی برس رہی تھی۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔

جس وقت وہ بس سے اتری تھی' بارش تیز ہو چکی تھی۔ مین روڈ سے بائی روڈ کا فاصلہ اس نے تقریباً بھاگتے ہوئے طے کیا تھا۔ پانچ منٹ کے بعد وہ اپنے گھر کے سامنے تھی۔ گھر کے عقبی جانب آتے ہی اُس نے سب سے اوپر والی سیڑھی پر کسی کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ کچھ حیران ہوئی تھی۔

اس وقت اتنی بارش میں کون بیٹھا ہے؟ اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی مگر دور سے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

"جولین کا کوئی بوائے فرینڈ ہوگا۔ شاید ابھی وہ نہیں آئی۔"

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے اوورکوٹ کی جیب سے کمرے کی چابی نکال لی تھی۔

سیڑھی پر جو بھی بیٹھا تھا اسے آتا دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ثانیہ نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے سرسری نظر اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔ اس کے ذہن میں جیسے ایک جھماکا ہوا تھا۔ سیڑھی کے کونے میں لٹکے ہوئے بلب کی ہلکی سی روشنی اس کا چہرہ شناخت کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ چند لمحے وہاں سے ہل نہیں سکی۔

اپنے کمرے کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنی تھی۔ دروازہ کھول کر اسے بند کیے بغیر وہ اندر کمرے میں چلی آئی تھی۔

"سڑک پر لفٹ کی آفر دینے کے بعد وہ شاید سیدھا یہیں آیا تھا مگر کیوں؟"

اس نے اپنا اوورکوٹ دروازے کے پیچھے لٹکاتے ہوئے سوچا تھا۔ وہ اندر آنے کے بجائے دروازے کے باہر ہی رک گیا تھا۔ ثانیہ نے خاموشی سے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ کچھ جھجکتے ہوئے اندر آیا تھا۔ وہ بری طرح بھیگا ہوا تھا۔

"اس طرح بھیگنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم برآمدے میں انتظار کر سکتے تھے۔" دروازہ بند کرتے ہوئے ثانیہ نے مدھم آواز میں اس سے کہا تھا۔

"بھیگنے سے کیا ہوتا ہے؟" اس نے مڑ کر پوچھا تھا۔ ثانیہ نے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

وہ شاید سیڑھیوں پر بیٹھا روتا رہا تھا۔ سات سال پہلے بھی اس نے ایک بار اسے اسی طرح پارک میں......

وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ ہیٹر آن کرنے کے بعد اس نے ایک فلور کشن اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"یہاں بیٹھ جاؤ۔"

وہ جوتے اتار چکا تھا۔ ثانیہ نے باتھ روم میں جا کر اپنا گیلا حجاب اتار کر دوسرا حجاب اوڑھ لیا تھا۔ وہ واپس کمرے میں آئی تو وہ فلور کشن پر بیٹھا ہوا تھا۔

"اپنا سویٹر اتار دو۔" اس نے ایک تولیہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

اس نے خاموشی سے تولیہ پکڑ کر اپنا سویٹر اتارنا شروع کر دیا۔ ثانیہ نے کیتلی میں کافی کے لیے پانی گرم ہونے کے لیے رکھ دیا۔ حدید نے سویٹر اتار کر کارپٹ پر رکھ دیا تھا اور تولیے سے بال خشک کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے پاس آئی تھی اور سویٹر کو سیدھا کر کے اس نے ہیٹر کے سامنے پھیلا دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی سرگرمیاں دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے ایک اونی شال تھمانے کے بعد

واپس کونے میں جا کر کافی بنانے میں مصروف تھی۔ جب اس نے حدید کی آواز سنی تھی۔

"کیا تم یہ سب کام میرے لیے ساری عمر نہیں کر سکتیں۔" وہ اپنی جگہ پر ساکت ہو گئی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟" اس نے سوچا تھا۔

"کیا اب بھی یہ ممکن ہے؟" اس نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ہیٹر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"شاید مجھے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔" ثانیہ نے سوچا تھا۔ کافی کی ٹرے اس نے حدید کے سامنے لا کر رکھ دی تھی۔

"تم جانتی ہو آج کیا دن ہے؟" اس نے کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

ثانیہ نے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہاں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔

"عید ہے۔" بہت مدھم آواز میں اس نے کہا تھا۔

"بس ......بس عید ہے۔" اس کی آواز میں عجیب سی مایوسی تھی۔

"تمہیں کچھ یاد نہیں؟" اسے یاد تھا مگر وہ خاموشی سے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کپ کو گھورتی رہی۔

"کم از کم تمہیں تو یاد......"

اس نے سر اٹھاتے ہوئے پرسکون انداز میں اس کی بات کاٹ دی تھی۔ "ہیپی برتھ ڈے حدید!" اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

"تمہیں میرا ایڈریس کہاں سے ملا؟"

"پروفیسر عبدالکریم سے۔" وہ خاموش ہو گئی تھی۔

"ابھی بھی اسی طرح روتے ہو جیسے پہلے......؟" اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں' اب تو بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ میں نہیں رویا۔ آخری بار تب رویا تھا جب تمہارے مرنے کی اطلاع...... ان چھ سالوں میں بہت بدل گیا ہوں۔ اب رونا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ آج پتا نہیں کیا ہوا۔ میں تمہارا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور پتا نہیں کیا ہوا۔ سارا ماضی یاد آنے لگا۔ یوں لگا جیسے بیچ کے چھ سات سال غائب ہو گئے ہوں۔ مجھے لگا میں ویسے ہی تم سے ملنے آیا ہوں جیسے چھ سات سال پہلے کیتھڈرل میں ملنے آتا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا تب میں بہت رویا کرتا تھا۔"

ثانیہ نے اس کے ہونٹوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ دیکھی تھی۔

"جتنا زار و قطار میں تمہارے سامنے رویا ہوں' کسی اور کے سامنے نہیں رویا۔" اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔ کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی تھی۔

لاحاصل

سین 33

دروازے پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ خدیجہ کی ساری حسیات بیدار ہو گئیں۔ چند لمحوں بعد اس نے کی ہول میں چابی لگنے کی آواز سنی۔ خلاف معمول مظہر نے ڈور بیل نہیں بجائی تھی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ مظہر اندر آیا۔ وہ اب اپنا کوٹ دروازے کے پیچھے لٹکا رہا تھا۔ خدیجہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

وہ کوٹ لٹکانے کے بعد اندر آیا۔ خدیجہ پر اس نے ایک نظر ڈالی اور پھر کچھ کہے بغیر بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ خدیجہ کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ بے اختیار سینٹر ٹیبل کا سہارا لیتے ہوئے وہ صوفہ پر بیٹھ گئی۔ پچھلے تین سالوں میں وہ اس کے ہر انداز ہر نظر کو پہچان چکی تھی۔ مگر چند لمحے پہلے خود پر پڑنے والی نظر سے وہ آشنا نہیں تھی...... اس کے تمام خدشات سچ ہو چکے تھے...... عاصم اسے پہچان چکا تھا اور اس نے......

"اس نے مظہر کو میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟" اس کا دل ڈوبنے لگا۔ "یہ کہ میں......" اس کا جسم سرد تھا مگر ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

تین سالوں میں تاش کے پتوں سے بنایا جانے والا گھر ہوا کے ایک ہی جھونکے میں زمین بوس ہو چکا تھا۔ "اب آگے کیا ہوگا؟ مجھے کیا کرنا چاہیے...... مظہر کے سامنے کس طرح......" زوال کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ لاؤنج کی خاموشی اس کے اعصاب کو چٹخانے لگی تھی۔

"مجھے اس سے بات کرنی چاہیے۔ اسے بتانا چاہیے کہ میں نے کیوں سب کچھ اس سے چھپایا...... میں کن حالات میں کال گرل بنی...... وہ تین سال سے مجھے جانتا ہے۔ میں جس طرح کی زندگی گزار رہی ہوں وہ اس کے سامنے ہے...... میں اس کے بچے کی ماں ہوں...... وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں نے تین سال میں کبھی اسے شکایت کا موقع نہیں دیا...... کبھی اس کی حکم عدولی نہیں کی۔ کبھی اسے دھوکا نہیں...... وہ صرف میرے ماضی کی بنا پر تو مجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ ایک اچھا مسلمان ہے۔ نماز پڑھتا ہے۔ روزے رکھتا ہے۔ زکوٰۃ دیتا ہے...... اسلام کے بارے میں مکمل علم رکھتا ہے۔ وہ مجھے معاف کر دے گا...... کچھ دیر کے لیے ناراض ضرور ہوگا' مگر مجھے معاف کر دے

گا۔ ہماری زندگی کو نارمل ہونے میں کچھ وقت لگے گا...... مگر پھر وہاں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔

دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے وہ بیڈ روم کے دروازے تک گئی۔ چند لمحوں تک وہ اپنی ہمت مجتمع کرتی رہی' پھر اس نے کانپتا ہوا ہاتھ دروازے پر رکھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے موجود بیڈ بے شکن تھا۔ لیکن کمرے کے ایک کونے میں موجود وارڈ روب کھلی ہوئی تھی اور مظہر اس وارڈ روب میں سے اپنے کپڑے نکال کر فرش پر پڑے ہوئے سوٹ کیس میں پھینکتا جا رہا تھا۔

خدیجہ کا دل ڈوب گیا۔ ''کیا وہ گھر چھوڑنے لگا تھا؟''

''مظہر! کیا...... کیا کر رہے ہو؟'' لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں اس نے مظہر کو مخاطب کیا۔

وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ وہ کچھ دیر اس کے جواب کی منتظر رہی' پھر کچھ اضطراب کے عالم میں آگے بڑھ آئی۔

''کیا بات ہے؟'' وہ اب بھی بے تاثر چہرے کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہا۔

خدیجہ نے وارڈ روب میں سے ایک سوٹ اتارتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔

''عاصم نے کیا کہا ہے تم سے؟'' مظہر نے اس کی بات کے جواب میں برق رفتاری سے بائیں ہاتھ کا تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ بری طرح فرش پر گری۔

''دوبارہ کبھی مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش مت کرنا۔'' وہ بلند آواز میں چلایا۔ تین سال میں پہلی بار اس نے مظہر کو چلاتے دیکھا تھا۔ خدیجہ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ اس کے لیے تشدد کوئی نئی چیز نہیں تھی' سولہ سال سے بائیس سال کی عمر تک وہ جس پیشے سے وابستہ رہی تھی۔ وہاں گالیاں' مار کٹائی اس پروفیشن کا ایک حصہ تھا (اگر اسے پروفیشن کہا جا سکے تو) مگر مظہر کے ہاتھ کے ایک تھپڑ نے اسے جتنی تکلیف پہنچائی تھی اس سے پہلے اسے اس کا سامنا نہیں ہوا تھا۔

مظہر ایک بار پھر اس کی طرف پشت کیے' اپنے کپڑے نکالنے میں مصروف تھا۔ خدیجہ کو اپنی ناک سے کوئی چیز بہتی محسوس ہوئی۔ اس نے ہاتھ لگا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ کی پوریں خون آلود ہو گئیں۔

قمیض کی آستین سے اس نے ناک سے بہنے والا خون صاف کیا اور ایک بار پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''مظہر پلیز! مجھے معاف کر دو...... تم مجھے مارنا چاہتے ہو تو مار لو...... بُرا بھلا کہنا چاہتے ہو کہو...... مگر یہاں سے مت جاؤ۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔

''یہاں سے نہ جاؤں ...... اور ساری زندگی ایک کال گرل کے ساتھ گزار دوں۔'' وہ اپنے کپڑے ہینگر سے اتارتے ہوئے رک گیا۔ ''تم نے کبھی سوچا ہے میرے ساتھ کیا کیا ہے تم نے؟ میری آنکھوں پر کس طرح پٹی باندھ کر چلا رہی ہو مجھے؟ ...... میری محبت اور خلوص کا کس طرح مذاق اڑایا ہے تم نے ...... میرا باپ ٹھیک کہتا تھا مغرب میں مرد اور عورت نہیں ہوتے ...... جانور

ہوتے ہیں۔ مہذب اور ترقی یافتہ نظر آنے والے جانور...... میرے خاندان کو جانتی ہو' تم وہاں کتا رکھنے سے پہلے اس کی بھی نسل دیکھی جاتی ہے۔ جس لڑکی سے میرا باپ میری شادی کروانا چاہتا تھا' اس کا سایہ تک کسی دوسرے مرد نے نہیں دیکھا ...... اور تم ...... تم وہ عورت ہو جو پیسوں کے عوض ......'' وہ رک گیا۔

خدیجہ کو لگا وہ ایک الاؤ میں کھڑی ہے اور مظہر اس الاؤ میں ایک ایک کر کے لکڑیاں ڈال رہا ہے۔

''مجھے لگتا ہے' مجھے اپنے والدین کی نافرمانی کی سزا ملی ہے تمہاری صورت میں......''

الاؤ میں ایک اور لکڑی گری۔ آگ اور بھڑکی۔ ''مظہر خان کی بیوی ایک کال گرل ...... Dusky Damsel یہی نام ہے نا تمہارا ...... جس سے تم یہاں جانی جاتی تھیں۔'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''میں سب کچھ چھوڑ چکی ہوں مظہر! سب کچھ' میں نے تمہارے ساتھ اپنی زندگی دوبارہ شروع کی ہے۔''

''کتنے عرصہ کے لیے؟ پانچ سال کے لیے یا دس سال کے لیے ...... اور کیوں جسٹ فار اے چینج یا پھر یہ سوچ کر کہ کبھی کبھی صرف ایک مستقل گاہک بھی تو ہونا چاہیے' میرے جیسا گاہک ...... جس کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی ہوں۔ پڑھا لکھا ہو...... خوبصورت ہو...... اور ہاں بے وقوف بھی ہو' جو تمہارے ساتھ شادی بھی کر لے' اپنے بچے کی ماں بھی بنا دے ...... ہے کوئی مظہر جیسا بے وقوف؟'' اس کے لہجے کی تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اب اپنا سوٹ کیس بند کر کے دوسرا سوٹ کیس کھول رہا تھا۔

''میرے ماضی کو مت دیکھو مظہر! میرے ماضی کو بھول جاؤ۔ میری آئندہ زندگی میں تم کوئی برائی نہیں پاؤ گے۔ میں تین سال سے تمہارے ساتھ ہوں ...... کیا میں نے تین سال میں خود کو اچھی بیوی ثابت نہیں کیا؟ کیا میں اچھی ماں نہیں ہوں؟ ...... کیا تین سال میں' میں نے تمہاری اطاعت نہیں کی ......؟ کیا تین سال میں' میں تمہارے علاوہ کسی دوسرے مرد کی طرف گئی؟ کیا میں نے اپنے جسم کو اس طرح چھپائے نہیں رکھا جس طرح تم نے چاہا؟ کیا میں نے اپنی نظروں کو اس طرح جھکائے نہیں رکھا جس طرح تمہاری خواہش تھی؟ کیا میں کبھی تم سے پوچھے بغیر گھر سے باہر نکلی؟ یا کسی ایسے شخص کو گھر میں آنے دیا جسے تم نے ناپسند کیا؟ کیا میں اسلام قبول کرنے کے بعد اس طرح عبادت نہیں کرتی جس طرح حکم ہے؟ کیا شادی سے پہلے میں نے تمہارے سامنے اپنی پارسائی کے ڈنکے بجائے تھے' جس اللہ سے تم محبت کرتے ہو' میں بھی اسی سے محبت کرتی ہوں' جس پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تم مانتے ہو' میں بھی اب اسی کو مانتی ہوں۔ دین کے جس راستے پر تم چل

رہے تھے اب میں بھی اسی پر چل رہی ہوں۔"

"تم نے جو کچھ کیا پیسے کے لیے کیا...... جو کچھ کر رہی ہو پیسے کے لیے کر رہی ہو۔" وہ اس کی بات پر ساکت رہ گئی۔

"جانتی ہو شادی سے پہلے کس علاقے میں رہتی تھیں اور اب کہاں ہو...... کون سی چیز ہے جو میں نے تمہیں مہیا نہیں کی...... میرے بجائے کوئی اور تمہیں یہ سب کچھ دیتا' چاہے اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہوتا تو تم وہی کرتیں جو وہ کہتا...... پارسا ہونے کے لیے کہتا تو پارسا ہو جاتیں اور تب تک پارسا ہی رہتیں جب تک سب کچھ ملتا رہتا۔" خدیجہ کا چہرہ زرد ہو گیا۔

"میں تمہاری پارسائی کو تب تسلیم کرتا اگر میرے بجائے کسی بھکاری سے شادی کرتیں جو تمہیں زندگی کی ہر نعمت کے لیے ترساتا اور تم پھر بھی مسلمان رہتیں پھر بھی پارسا رہتیں پھر بھی اس شخص کی وفاداری ہوتیں پھر بھی اسی طرح عبادت کرتیں پھر بھی گھر کے اندر رہتیں پھر بھی اپنے شوہر کی اطاعت کرتیں۔ اچھی بیوی بنتیں' اچھی ماں ہوتیں...... مگر تب تم کبھی یہ سب کچھ نہ کرتیں' اگر تم میں اتنی قناعت ہوتی تو تم کچھ بھی ہوتیں مگر کال گرل نہ ہوتیں۔" وہ اپنا دوسرا سوٹ کیس بھی اپنی کتابوں اور دوسری چیزوں سے بھر چکا تھا۔

"نہیں تم سے پیسے کے لیے شادی نہیں کی تھی۔ تم سے یہ سوچ کر بھی شادی نہیں کی تھی کہ تم بہت پڑھے لکھے ہو' یا بہت بڑے وکیل بنو گے...... تم سے تو اس عزت کے لیے شادی کی جو تم مجھے دے رہے تھے' پیسہ بہت سے لوگوں نے دیا مجھے لیکن عزت کسی نے نہیں دی۔" وہ اب جیسے بڑبڑا رہی تھی۔ "خواہش ہونے لگی میں ویسی زندگی گزاروں جیسی تم گزارتے تھے۔ مجھے لگا میں تمہارے ساتھ بات کر سکتی ہوں۔ اللہ کے بارے میں بلکہ شاید صرف تم ہی سے بات کر سکتی تھی اللہ کے بارے میں...... میں نے ان دنوں اپنے مذہب کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی اللہ سے اتنی دعا کی...... کہ تم مجھے مل جاؤ کہ تم میرا مقدر بن جاؤ کہ تم کو میرے بارے میں کچھ پتا نہ چلے۔ یقین کرو مظہر! میں نے اس رمضان میں روزے بھی رکھے تھے صرف اس لیے کہ تم رکھتے تھے۔ میں ہر وہ چیز کرتی تھی جو تم کرتے تھے۔ میں نے پیسہ کہاں دیکھا تھا تمہارا۔"

"طوائف کا خدا صرف پیسہ ہوتا ہے...... اس کا ہر رشتہ پیسے سے شروع ہوتا ہے' پیسہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ کا نام لے تو یہ بھی ڈھونگ لگتا ہے۔ کیا طوائف کو کبھی اللہ مل سکتا ہے؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہا تھا۔

وہ کچھ بول نہیں سکی۔ اس نے اعتراف کیا' زندگی میں بہت سے سوال لاجواب کر دیتے ہیں۔

"ہاں' یہ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ کیا طوائف کو اللہ مل سکتا ہے؟"

مظہر ایک سوٹ کیس اٹھا کر بیڈ روم سے نکل گیا۔ خدیجہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ دیر کے بعد دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اور دوسرے سوٹ کیس اٹھانے لگا۔

"تم ایک اچھے مسلمان ہو! مظہر ایک عملی مسلمان۔ ایک اچھا مسلمان معاف بھی تو کر دیتا ہے۔ تم مجھے معاف کر دو۔" مظہر نے ایک نظر اس پر ڈالی اور دوٹوک انداز میں کہا۔

"نہیں' طوائف کو کوئی معاف نہیں کرتا اور میں نے زندگی میں اتنے گناہ نہیں کیے کہ مجھے اپنی زندگی ایک کال گرل کے ساتھ گزارنی پڑے یا میری اولاد ایک کال گرل کے ہاتھوں میں پرورش پائے۔" وہ ایک بار پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ خدیجہ یک دم لرز گئی۔

"اولاد؟ کیا وہ اپنے بیٹے کو بھی لے جائے گا؟" وہ تقریباً بھاگتی ہوئی بے بی کاٹ کے پاس گئی جہاں اس کا بیٹا سو رہا تھا۔

مظہر کچھ دیر بعد پھر بیڈ روم میں آیا۔ اس بار وہ سائیڈ ٹیبل کے پاس گیا۔ ایک کاغذ پر اس نے کچھ لکھا۔ جیب سے چیک بک نکال کر ایک چیک سائن کیا اور پھر بے بی کاٹ کی طرف بڑھا۔ خدیجہ خوف کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ کاغذ اور چیک کو اس نے خدیجہ کی طرف اچھالا اور خود بچے کو اٹھانے لگا۔

"نہیں مظہر! اس کو مت لے جاؤ۔ اسے میرے پاس رہنے دو...... یہ بہت چھوٹا ہے۔ میرے بغیر کیسے رہے گا؟" خدیجہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو پکڑ لیا۔ مظہر نے ایک جھٹکے سے اسے کھینچ لیا۔

"میں نے تمہیں طلاق دے دی ہے' اس لیے اپنے بیٹے کو یہاں چھوڑنے کا تو جواز ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"نہیں مظہر! تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ یہ میرا بیٹا ہے' میرے پاس رہے گا۔ کچھ تو میرے پاس رہنے دو۔" وہ روتی ہوئی اس کے سامنے آ گئی۔

"میں اپنی اولاد تمہارے پاس نہیں چھوڑوں گا' تمہارے پاس اسے چھوڑنے کے بجائے میں اسے مار دوں گا۔ تمہارے سامنے مار دوں؟" مظہر نے ایک ہاتھ بچے کی گردن پر رکھ دیا۔ وہ بے اختیار خوف کے عالم میں پیچھے ہو گئی۔

"کبھی اس کے لیے کچھ مت کرنا۔ جس دن تم نے کورٹ کے ذریعے اسے لینے کی کوشش کی' اس دن میں اسے قتل کر دوں گا لیکن تمہیں نہیں دوں گا۔ تمہیں اگر اس سے محبت ہے تو دوبارہ کبھی اس کے پیچھے مت آنا۔ میں حق مہر کا چیک چھوڑے جا رہا ہوں۔ میں تمہیں طلاق دے چکا ہوں۔ کچھ دنوں بعد تمہیں باقاعدہ طور پر طلاق کے کاغذات بھی مل جائیں گے۔" اس کا بیٹا اب اٹھ کر رونے لگا تھا۔

"تم تب تک اس گھر میں رہ سکتی ہو جب تک کرایہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کے بعد اپنے لیے نیا ٹھکانہ ڈھونڈ لینا اور تمہارے جیسی عورتوں کے لیے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" وہ اب بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ ماؤف ہوتے ہوئے ذہن کے ساتھ اسے باہر جاتا دیکھتی رہی۔

سب کچھ ختم ہونے میں صرف چند گھنٹے لگے تھے۔ عاصم کی آمد' اس کی روانگی اور اس کے بعد مظہر کا اپنے بیٹے کو لے کر چلے جانا۔

وہ خالی دماغ کے ساتھ بیڈ روم سے نکل آئی۔ لاؤنج خالی تھا۔ دنیا بھی خالی تھی۔ باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا' اس کے اندر بھی بہت سارے دروازے کھل گئے تھے۔ اسے یاد آیا' اس کا بیٹا رو رہا تھا۔ وہ یک دم ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی بیرونی دروازے سے باہر نکلی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کہیں بھی کچھ نہیں تھا سڑک سنسان تھی' بس اس پر برف گر رہی تھی۔

وہ باہر سڑک پر آ گئی۔ دونوں طرف کہیں بھی مظہر کی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے پاؤں ٹھنڈی برف پر سن ہو رہے تھے۔ اس کے جسم پر موجود لباس پھڑ پھڑا رہا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر لگے ہوئے لیمپ پوسٹ کے نیچے بیٹھ گئی۔ وہاں سے گزرنے والا کوئی بھی شخص اس وقت اس حالت میں دیکھ کر اسے پاگل سمجھتا۔

لیمپ کی روشنی میں اس نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو پھیلا کر دیکھا۔ اسے یاد آیا۔ بہت سال پہلے اس کے ایک ہندو گاہک نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہیں جس سے محبت ہو گی تمہاری اس سے شادی ہو جائے گی۔" تب اس نے ہنس کر اس شخص سے کہا تھا۔

"میری کبھی شادی نہیں ہو گی۔ کال گرل سے کون شادی کرتا ہے۔"

"تمہاری نہ صرف شادی ہو گی بلکہ ایک ایسا بیٹا بھی ہو گا جس پر تمہیں فخر ہو گا۔" اس شخص نے کندھے اچکاتے ہوئے اس سے کہا۔

"کال گرل کی شادی' اولاد اور فخر؟" وہ بہت دیر تک پاگلوں کی طرح اس شخص کی بات پر ہنستی رہی یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

اور اب برف میں ننگے پاؤں اور ننگے سر لیمپ پوسٹ کے نیچے بیٹھی' وہ اپنے ہاتھ کی لکیروں میں اپنا مقدر ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"مجھے کیا کرنا چاہیے؟ رونا چاہیے؟ چلانا چاہیے؟ یا پھر مر جانا چاہیے؟ میں اس شہر میں کس کو جا کر بتا سکتی ہوں کہ آج رات میں برباد ہو گئی ہوں۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا؟ کچھ بھی نہیں رہا۔ میں کس کے کندھے پر سر رکھ کر رو سکتی ہوں؟"

اسے یاد نہیں وہ وہاں کتنی دیر بیٹھی رہی۔ پچھلے تین سال ایک فلم کی طرح اس کی نظروں

کے سامنے چل رہے تھے۔ مظہر سے ہونے والی پہلی ملاقات اور اس سے ہونے والی آخری ملاقات ......درمیان میں کیا تھا حقیقت یا خواب۔

پھر اسے یاد آیا اس کا بیٹا رو رہا تھا۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھی اور تب اسے پتہ چلا اس پر کتنی برف پڑ چکی ہے۔ اس نے جتنی تیزی سے قدم اٹھایا وہ اتنی ہی تیزی سے منہ کے بل برف پر گری۔ اس کے پیر شاید برف بن چکے تھے۔

"مظہر کے دل کی طرح یا پھر میرے مقدر کی طرح۔" اس نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔

"مظہر نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ اس کے بغیر میرا کیا ہو گا۔" گھر کی سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے وہ تین بار برف میں گری۔

اسے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کہاں تھی؟ کیوں تھی؟ وہ یہ بھی سمجھنے سے قاصر تھی' گھر کے اندر پہنچنے کے بعد بھی وہ خالی نظروں کے ساتھ وہاں پڑی چیزوں کو دیکھتی رہی۔

دربارِ دل

سین 34

میرے سامنے ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ہوئے گلاس میں موجود مشروب یک دم اور سیاہ ہو گیا تھا۔ گلاس کے کناروں پر میری لپ اسٹک کے نشان تھے۔ کوئی اُن نشانوں پر انگلی پھیر کر یا محض ایک نظر ڈال لینے پر یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ میرے ہونٹ خوبصورت تھے۔ مشروب میں موجود برف کے کیوبز اب بہت ننھے ننھے سے رہ گئے تھے...... چند لمحوں میں وہ بھی تحلیل ہو جاتے...... اس سیاہ مشروب میں غائب ہو جاتے بالکل اسی طرح جس طرح میں ہو رہی تھی...... ابھی...... اس وقت......

میرے بائیں طرف ٹیبل کے سرے پر بیٹھا قہقہے لگانے والا مرد میرا شوہر تھا...... اور ''وہ'' تھا جسے میں نے دنیا میں سب سے زیادہ چاہا تھا...... ہنستے ہوئے اس کا ''سفید چہرہ'' سرخ ہو رہا تھا...... اور وہ ''سفید شرٹ'' پہنے ہوئے تھا اور "D&G" کا آفٹر شیو اس کے وجود کو مہکا رہا تھا اور اس کی کلائی میں "Gucci" کی گھڑی تھی اور اس کی پلیٹ میں ''فرائیڈ چکن'' کا ایک ٹکڑا اور اس کے گلاس میں ''لیمن سپرائٹ''...... اور میں...... میں...... میں...... دربارِ دل میں تھی...... کسی نے میری آنکھوں سے پٹی اتار دی تھی مجھے ٹھیک طرح سے دیکھنے کے لیے آنکھیں جھپکنا بھی نہیں پڑا...... سب کچھ نظر آ رہا تھا...... صاف نظر آ رہا تھا۔

مگر میری بینائی کو واپس آنے میں بہت دیر لگ گئی تھی اتنی دیر کہ اب سامنے نظر آنے والے منظر پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا...... خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لینے پر بھی میرا ذہن یہ سب کچھ تسلیم کرنے سے انکار کر رہا تھا...... ذہن جو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا آنکھیں اور دل نہیں مان رہا تھا...... اور آنکھیں جو کچھ دکھانے کی کوشش کر رہی تھیں...... ذہن اس پر یقین نہیں لا رہا تھا۔

مجھے اپنا وجود یک دم برف کا بت بنتا محسوس ہوا تھا یا پھر کانچ کا مجسمہ...... جو انگلی کی ہلکی سی ضرب سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا...... یوں ڈھے جاتا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں...... میں نے اپنے ہونٹ بھینچنے کی کوشش کی...... اور میرے ہونٹوں نے میرا ساتھ نہیں دیا ایک عجیب **Defiance** تھی جو میرے وجود کے ہر عضو میں اتر آئی تھی...... مہر سمیع کا اپنا جسم اس کو **Own** کرنے سے

انکار کر رہا تھا...... وہ کسی اور کے اشارے پر چل رہا تھا...... کسی اور کے اشارے پر؟...... میں، میں پس رہی تھی...... مہر سمیع...... میرا ذہن سب کچھ تسلیم کرنے کی سعی میں مصروف تھا۔

اور مراد...... وہ ہنس رہا تھا...... میرا شوہر...... وہ شخص جسے میں نے سب سے بڑھ کر چاہا تھا...... وہ ہنس رہا تھا۔ اس کی ہنسی میں کانٹوں جیسی چبھن تھی...... وہ مجھ پر ہنس رہا تھا...... اور پھر میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے چھری اور کانٹے کو بھی یک دم ہنستے دیکھا...... پھر ٹیبل پر میرے سامنے پڑی میری ڈنر پلیٹ...... پھر میرا گلاس...... باری باری سب ہنسنے لگے تھے اور پھر میز پر پڑی ہر شے...... ہر چیز...... ڈشز، پلیٹیں، چمچ، کانٹے، چھریاں، ڈونگے، گلاسز...... سب اس کورس میں شامل ہو گئے تھے...... پھر ٹیبل، کرسیاں، ڈیکوریشن پیسز، دیوار پر لگی **Paintings**، لائٹس، پردے، فرنیچر، ڈرائنگ روم اور ڈائننگ کی ہر شے قہقہے لگانے لگی تھی۔ ان سب کی نظریں مجھ پر تھیں اور ان سب کی انگلیاں بھی مجھی پر اٹھی ہوئی تھیں...... وہاں کمرے میں موجود ہر شے کا جیسے ایک چہرہ اُگ آیا تھا اور ہر چہرے کی نظریں مجھ پر تھیں...... اور میں...... میں انہیں دیکھ نہیں پا رہی تھی۔

میرے ہاتھ سے کانٹا پلیٹ میں گرا...... مراد نے مجھے چونک کر دیکھا۔ ''کیا ہوا؟''......

''تم نے کھانا کیوں چھوڑ دیا؟'' مراد نے مجھ سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

''اور انسان شر کو اس طرح مانگتا ہے جس طرح خیر کو بے شک انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔'' سورۃ بنی اسرائیل پارہ 15۔

''بھابھی کیا ہوا؟'' یہ مونس تھا...... میرے شوہر کا بہترین دوست...... ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ بھی مراد کی تشویش میں شامل تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو دیکھا...... اس کے نام کو دل میں دہرایا...... مونس...... موی...... بے یقینی تھی کہ بھنور کی طرح مجھے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی اور میں بے بسی سے اس کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''پریکٹیکل جوک'' کسی نے میرے سر پر کچھ مارا۔ ''500 روپے'' ایک دوسری آواز نے سرگوشی کی۔ ''1000 روپے'' آوازیں تھیں کہ بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ میں نے سانس لینے کی کوشش کی...... میں نے آوازوں کی بازگشت سے فرار ہونے کے لیے کوشش کی۔

''کیا بات ہے مہر؟'' وہ پھر مراد تھا۔ اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا مگر میرے ہاتھ نے اس کے ہاتھ کا لمس محسوس نہیں کیا۔ میں نے اپنے ہاتھ کو دیکھا...... وہ لمس محسوس کیوں نہیں کر رہا تھا...... کیا ''وہ'' نہیں تھا؟...... ''یا میں'' نہیں تھی؟

''کھانا کھانا کیوں بند کر دیا؟'' وہ پوچھ رہا تھا...... ''میں کیوں کھا رہی تھی؟'' میں سوچ رہی تھی۔ ''اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟'' اسے میری نظریں عجیب لگیں۔ ''اس طرح کیا دیکھ رہی تھی؟'' میں نے سوچا...... وہ تو کبھی بھی چہرہ نہیں تھا میرے لیے...... صرف آواز تھی...... پھر میں

چہرے کو کیوں دیکھ رہی تھی؟...... کیا دیکھ رہی تھی؟...... جب آوازیں چہروں میں تبدیل ہوتی ہیں تو کیا وہ سب کو اسی طرح بھیانک لگتی ہیں۔ جیسے مجھے لگ رہی تھی...... یا پھر یہ سب صرف میرے ساتھ ہی ہوا تھا...... میرے ساتھ ہی ہونا تھا؟......

"مہر کیا سوچ رہی ہو؟" آواز نے ایک بار پھر کہا...... نہیں چہرے نے ایک بار پھر کہا...... ہاں۔ یہ وہی تو تھا...... وہی آواز...... پھر آخر میں نے اسے Illusion کیوں سمجھا؟...... کیوں جانا؟...... میں نے اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنے ہاتھ کو کھینچا...... میں اس کی نہیں تھی۔ میں کسی اور کی تھی...... کس کی؟...... میں نے دل کو ٹٹولا۔

15 اگست 2001

سین 35

اور یہاں واپس آنے کے بعد پہلی بار یہ جملہ میں نے اپنے ایک کولیگ کی بیوی سے 1963ء میں سنا جب وہ ہمارے گھر کھانے کی ایک دعوت پر آئے۔ میں چپ چاپ اس عورت کا چہرہ دیکھتا رہا۔ لفظ میرے اندر موم کی طرح گھل گئے تھے۔

"اس ملک میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی ہوئی اس عورت کو دیکھا جو زرق برق کپڑوں میں ملبوس تھی' جس کے ہاتھوں میں بہت سے زیور تھے۔

اس ڈائننگ ٹیبل کو دیکھا جو کھانے کے بہت سے لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔ اور پھر اس عورت کی بھری ہوئی پلیٹ کو دیکھا...... پھر مجھے دو چادروں میں سیئے ہوئے اپنے بھائی کی لاش کے ٹکڑے یاد آئے۔ آگ سے جلتے ہوئے گھر میں اپنی دونوں بہنوں کی چیخیں یاد آئیں۔

مٹی کی وہ پوٹلی یاد آئی جو میرے باپ نے مرنے سے پہلے سلیمہ کو اپنے پاس رکھنے کے لیے دی تھی۔ میری بھوک ختم ہوگئی میں نے چاولوں سے بھرا ہوا چمچ دھیرے سے پلیٹ میں الٹا دیا۔

"کسی بھی ملک میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہر ملک زمین کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ اصل چیز اس زمین کے ٹکڑے پر بسنے والے لوگوں کے اندر ہوتی ہے' خامی ہمیشہ ان لوگوں کے اندر ہوتی ہے' اور یہ خامی اس ملک کا تعارف بن جاتی ہے۔ ایسا سائن بورڈ جسے پھر وہ ملک اٹھائے پھرتا ہے۔"

میں خاموش رہا تھا مگر سلیمہ خاموش نہیں رہی۔ بڑے پرسکون اور ٹھنڈے لہجے میں اس نے اس عورت سے کہا۔ اس بار خاموشی اس عورت پر چھائی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو مشکور نظروں سے دیکھا جواب میرے کولیگ کو ایک ڈش سرو کر رہی تھی۔

امربیل

سین 36

کمرے میں داخل ہونے کے بعد عمر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''دادو نے بتایا تھا' تمہیں پرفیومز بہت اچھے لگتے ہیں۔ یہ تمہارے اور میرے درمیان پہلی کامن چیز ہے۔ مجھے بھی پرفیومز بہت پسند ہیں۔''

وہ اس کی طرف پشت کیے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز کھول کر کچھ تلاش کرتے ہوئے بول رہا تھا۔

علیزہ کی نظریں ڈریسنگ ٹیبل پر مرکوز تھیں' جہاں پر پرفیومز کا ایک ڈھیر موجود تھا۔ وہ بے اختیار کچھ آگے بڑھ آئی تھی۔

''عام طور پر مرد کبھی خواتین کے پرفیومز استعمال کرنا پسند نہیں کرتے مگر میں ہر وہ پرفیوم خرید لیتا ہوں جو مجھے پسند ہو۔ چاہے وہ خواتین ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔ استعمال کروں یا نہ کروں لیکن پاس رکھنے میں کیا ہرج ہے۔''

اس سے باتیں کرتے ہوئے اس کی تلاش ابھی بھی جاری تھی پھر جیسے اسے وہ چیز مل گئی تھی۔ وہ سیدھا ہونے کے بعد اس کی طرف مڑا تھا۔ علیزہ نے اس کے ہاتھ میں Chanel کی ایک پیکڈ شیشی دیکھی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس نے ہاتھ علیزہ کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''یہ تمہارے لیے ہے۔'' علیزہ نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

''میرے لیے؟'' اس نے سوالیہ لہجہ میں پوچھا تھا۔

''ہاں دوستی کرنے کے لیے پرفیوم سے اچھا گفٹ تو کوئی نہیں ہو سکتا اور میں اپنے فرینڈز کو ہمیشہ پرفیوم ہی گفٹ کرتا ہوں۔''

وہ ہاتھ بڑھائے کہہ رہا تھا۔ علیزہ نے ایک بار پھر اس کے ہاتھ کو دیکھا تھا۔ وہ کچھ جھجک گئی تھی۔

''Just take it'' عمر نے ایک بار پھر اس سے کہا تھا۔

''مگر میں......'' اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر عمر نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''اگر مگر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' بس یہ لے لو۔'' اس نے بڑے مستحکم لہجے میں کہا تھا۔

کچھ جھجکتے ہوئے اس نے عمر کے ہاتھ سے پرفیوم پکڑ لیا تھا۔ ''مجھے یہ تو نہیں پتا کہ تمہارا فیورٹ پرفیوم کون سا ہے مگر مجھے بہت اچھا لگتا ہے' اگر کوئی لڑکی یہ پرفیوم استعمال کرے۔ ویسے تمہیں کون سا پرفیوم پسند ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''مجھے وہ سارے پرفیومز پسند ہیں جو لڑکوں کے لیے ہوتے ہیں۔''

اس کی بات پر عمر یک دم کھلکھلا کر ہنسا تھا۔ ''گڈ' تمہارے اور میرے درمیان یہ دوسری کامن چیز ہے پھر تو تمہیں شنیل کے بجائے 212 Men دینا چاہیے تھا۔'' اس نے ایک دوسرے پرفیوم کا نام لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں مجھے Eternity اور Joy زیادہ پسند ہیں۔'' علیزہ نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

''اور مجھے Baby Doll اور Ripple''۔ عمر نے اپنی پسند بتائی تھی۔ علیزہ کو یک دم اس میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

''عمر اتنا برا نہیں ہے جتنا میں سمجھ رہی تھی۔ وہ اچھا ہے۔'' اس نے فوراً نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔

''کیا میں یہ پرفیوم دیکھ لوں؟'' اس نے ہاتھ سے ڈریسنگ کی طرف اشارا کیا تھا۔

''Sure why not'' (ہاں' کیوں نہیں۔) عمر نے دوستانہ انداز میں کہا تھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

وہ بڑے متجسس انداز میں ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھی۔ پرفیومز کا انبار دیکھ کر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون سا پرفیوم پہلے اٹھا کر دیکھے۔ اس نے سب سے پہلے سب سے چھوٹی شیشی اٹھائی تھی۔ وہ White Linen تھا' پھر باری باری وہ ہر شیشی اٹھا کر دیکھتی رہی۔ کچھ پرفیومز بالکل استعمال نہیں کیے گئے تھے۔

''میں ہر ماہ کچھ اور خریدوں یا نہ خریدوں لیکن پرفیومز ضرور خریدتا ہوں۔ ان کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔'' وہ پاس کھڑا بتا رہا تھا۔

''لیکن آپ پرفیومز زیادہ استعمال تو نہیں کرتے؟'' علیزہ نے ایک پرفیوم ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

''دن میں نہیں لگاتا' رات کو لگاتا ہوں۔'' علیزہ نے اس کے جواب پر کچھ حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ ''سونے سے پہلے۔'' وہ اس کی حیرانی کی وجہ جیسے جان گیا تھا۔

''کیوں؟'' وہ کچھ اور الجھی تھی۔

''دن کے وقت آپ اتنے بہت سے کاموں میں مصروف ہوتے ہیں کہ پرفیومز

انجوائے نہیں کر سکتے۔ ہمارا دھیان دوسری چیزوں کی طرف ہوتا ہے۔ ہاں رات کو آپ کسی بھی پرفیوم کی مہک کو بہت اچھی طرح انجوائے کر سکتے ہیں کیونکہ آپ کسی بھی مہک کو بہت اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ اس وقت Senses بہت شارپ ہوتی ہیں۔"

علیزہ نے بہت توجہ سے اس کی "فلاسفی" سنی تھی۔ اب وہ اسے خود کچھ پرفیوم دکھا رہا تھا پھر اس نے ایک چھوٹی سی بوتل اٹھائی تھی۔ اس کی طرف وہ بوتل بڑھاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"یہ Enigma ہے۔ اس ٹیبل پر سب سے قیمتی چیز Extracted Essence ہے۔ یہ پاپا نے گفٹ کیا تھا' ورنہ میں اسے افورڈ نہیں کر سکتا۔ بہت احتیاط سے میں اسے استعمال کرتا ہوں تاکہ یہ جلدی ختم نہ ہو۔"

علیزہ کی توجہ اس شیشی پر مرکوز تھی۔ اسے ہاتھ میں لے کر اس نے ڈھکن کھول کر خوشبو محسوس کرنے کی کوشش کی تھی۔ سانس اندر کھینچتے ہی اس نے اپنے اندر ایک عجیب سی تازگی محسوس کی تھی۔

"Exotic" علیزہ نے بے اختیار کہا تھا۔ اس کے ریمارکس پر عمر کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

علیزہ نے ایک دو بار سونگھنے کے بعد اس چھوٹی سی شیشی کو بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ نہیں جانتی' کیا ہوا تھا مگر شیشی یک دم اس کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں صرف ڈھکن رہ گیا تھا۔ ایک ثانیے میں شیشی ڈریسنگ ٹیبل پر گری اور پھر وہاں سے اچھل کر نیچے کارپٹ پر گر پڑی۔ علیزہ نے بے اختیار اسے پکڑنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ کمرہ یک دم تیز خوشبو سے بھر گیا تھا۔ علیزہ نے مایوسی سے شیشی اٹھائی تھی۔ اس میں اب صرف چند قطرے باقی تھے۔ اس نے شرمندگی سے عمر کو سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

"پتا نہیں کیسے......" اس کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ بات کیسے مکمل کرے۔

وہ چند لمحے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا تھا اور پھر اس نے سکون سے ہاتھ بڑھا کر اس سے شیشی اور ڈھکن لے لیا تھا۔ "اٹس آل رائٹ۔ یہ قیمتی تھا مگر میرا فیورٹ نہیں۔"

علیزہ اس کی بات پر یک دم اضطراب کا شکار ہو گئی تھی۔

"آئی ایم سوری۔ میری وجہ سے۔" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر عمر کی حرکت نے اسے ہکا بکا کر دیا تھا۔ عمر نے ڈریسنگ ٹیبل سے ایک پرفیوم اٹھایا تھا اور پھر پوری طاقت سے سامنے والی دیوار پر کھینچ مارا تھا۔ شیشی ٹوٹتے ہی کمرہ ایک بار پھر تیز خوشبو سے بھر گیا تھا۔

"چیزیں ٹوٹنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ تو چیزیں توڑنے میں مزہ آتا ہے۔ تا علیزہ! آؤ' ایک ایک پرفیوم اور توڑیں۔"

اس نے پرسکون انداز میں کہتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل سے دو پرفیوم اٹھا لیے اور ایک اس

کی طرف بڑھا دیا۔ وہ جیسے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"آپ بہت عجیب ہیں۔" اس نے کچھ بے چین ہو کر عمر سے کہا تھا۔

"اس کو میں کیا سمجھوں۔ Compliment یا Comment (تعریف یا تبصرہ)۔"

عمر کا اطمینان برقرار تھا۔ وہ یک دم بہت الجھ گئی تھی۔ عمر نے دونوں پرفیوم ایک بار پھر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیے تھے اور پھر ایک اور پرفیوم اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ "Ecstacy یہ میں تب لگاتا ہوں جب خود کو بہت اکیلا محسوس کرتا ہوں۔"

اس نے سلسلہ وہیں سے جوڑنے کی کوشش کی تھی جہاں سے ٹوٹا تھا۔ علیزہ نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ وہ اب اس کمرے سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ وہاں اس کی ساری دلچسپی یک دم ختم ہو گئی تھی۔

"یہ پرفیوم نہیں دیکھنا چاہتیں؟" عمر نے بڑے دوستانہ انداز میں پوچھا تھا۔ علیزہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ عمر نے اس کی آنکھوں میں ابھرتی ہوئی نمی کو دیکھ لیا تھا اور کمال مہارت سے نظر انداز بھی کر دیا تھا۔ Chanel 5 کی بوتل اٹھا کر اس نے ڈھکن اتارا تھا اور پھر بڑے آرام سے علیزہ کے بالوں پر اس نے اسپرے کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹی تھی۔ اسے اپنی گردن اور بالوں پر نمی محسوس ہوئی۔

"یہ پرفیوم دنیا کی سب سے اچھی اور Precious (مکمل) لڑکیوں کے لیے ہوتا ہے اور علیزہ میرا خیال ہے' تم ان لڑکیوں میں شامل ہو۔"

اس نے سائفن کو پریس کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ڈھکن بند کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر پرفیوم ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ علیزہ کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ کس ردعمل کا اظہار دیا۔ علیزہ کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ کس ردعمل کا اظہار کرے۔ عمر بہت عجیب تھا۔ اس نے Chanel 5 اٹھا کر باہر نکلنا چاہا تھا۔

"اب تو تم ناراض نہیں ہونا؟" علیزہ نے اپنے پیچھے عمر کی آواز سنی تھی۔ اس نے مڑ کر عمر کو دیکھا تھا۔ وہ وہیں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

علیزہ نے کچھ کہنے کے بجائے صرف سر ہلا دیا تھا۔ عمر کی مسکراہٹ کی دلکشی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"So Aleeza we are friends and true friends are frinds forever."

(تو علیزہ ہم دوست ہیں اور سچے دوست ہمیشہ دوست رہتے ہیں۔)

علیزہ نے اسے کہتے سنا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی ایک مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔

"کیا اب آپ مجھے......"

پیرِ کامل

سین 37

اس نے گاڑی نہر کے پل سے کچھ فاصلے پر کھڑی کر دی پھر ڈگی سے ایک بوری اور رسی نکال لی۔ وہ بوری کو کھینچتے ہوئے اس پل کی طرف بڑھتا رہا۔ پاس سے گزرنے والے کچھ راہ گیروں نے اسے دیکھا مگر وہ رکے نہیں' اوپر پہنچ کر اس نے اپنی شرٹ اُتار کر نہر میں پھینک دی۔ چند لمحوں میں اس کی شرٹ بہتے پانی کے ساتھ غائب ہو چکی تھی۔ ڈارک بلو کلر کی تنگ جینز میں اس کا لمبا قد اور خوب صورت جسم بہت نمایاں تھا۔

اس وقت اس شخص کی آنکھوں میں کوئی ایسا تاثر تھا جسے پڑھنا دوسرے کسی بھی شخص کے لئے ناممکن تھا۔ اس کی عمر انیس بیس سال ہوگی' مگر اس کے قد و قامت اور حلیے نے اس کی عمر کو جیسے بڑھا دیا تھا۔ اس نے رسی پل سے نیچے نہر میں لٹکانی شروع کر دی' جب رسی کا سرا پانی میں غائب ہو گیا تو اس نے رسی کا دوسرا سرا بوری کے منہ پر لپیٹ کر سختی سے گرہیں لگانی شروع کر دیں اور اس وقت تک لگاتا رہا جب تک کوائل ختم نہیں ہوگا پھر پانی میں پڑا سرا واپس کھینچ کر اس نے اندازے سے تین فٹ کے قریب رسی چھوڑی اور اپنے دونوں پیر ساتھ جوڑتے ہوئے اس نے اپنے پیروں کے گرد رسی کو بہت مضبوطی کے ساتھ دو تین بل دیئے اور گرہ لگا دی۔ اب اس تین فٹ کے ٹکڑے کے سرے پر بڑی مہارت کے ساتھ اس نے دو پھندے بنائے پھر اچک کر پل کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ اپنا دایاں ہاتھ کمر کے پیچھے لے جاتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ کے ساتھ پہلے پھندے میں سے دایاں ہاتھ گزارا اور پھر بائیں ہاتھ کے ساتھ اس نے وہ پھندا کھینچ کر کس دیا۔ اس کے بعد اس نے کمر کے پیچھے دائیں ہاتھ کے ساتھ دوسرے پھندے میں سے بایاں ہاتھ گزارا اور دائیں ہاتھ سے اسے کس دیا۔

اس کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے پشت کے بل خود کو پل کی منڈیر سے نیچے گرا دیا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کا سر پانی سے ٹکرایا اور کمر تک کا حصہ پانی میں ڈوب گیا پھر رسی ختم ہوگئی۔ اب وہ اس طرح لٹکا ہوا تھا کہ اس کے بازو پشت پر بندھے ہوئے تھے اور کمر تک کا دھڑ پانی کے اندر تھا۔ بوری میں موجود وزن یقیناً اس کے

وزن سے زیادہ تھا یہی وجہ تھی کہ بوری اس کے ساتھ نیچے نہیں آئی اور وہ اس طرح لٹک گیا۔ اس نے اپنا سانس روکا ہوا تھا۔ پانی کے اندر اپنا سر جاتے ہی اس نے آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پانی گدلا تھا اور اس میں موجود مٹی اس کی آنکھوں میں چبھنے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے پھیپھڑے اب جیسے پھٹنے لگے تھے۔ اس نے یک دم سانس لینے کی کوشش کی اور پانی منہ اور ناک سے اس کے جسم کے اندر داخل ہونے لگا۔ وہ اب بری طرح پھڑ پھڑا رہا تھا مگر نہ وہ اپنے بازوؤں کو استعمال کر کے خود کو سطح پر لا سکتا تھا اور نہ ہی اپنے جسم کو اُٹھا سکتا تھا۔ اس کے جسم کی پھڑ پھڑاہٹ آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھی۔

چند لوگوں نے اسے پل سے نیچے گرتے دیکھا اور چیختے ہوئے اس طرف بھاگے' رسی ابھی تک ہل رہی تھی' ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ پانی کے نیچے ہونے والی حرکت اب دم توڑ گئی تھی۔ اس کی ٹانگیں اب بالکل بے جان نظر آ رہی تھیں۔ پل پر کھڑے لوگ خوف کے عالم میں اس بے جان وجود کو دیکھ رہے تھے۔ پل پر موجود ہجوم بڑھ رہا تھا۔ نیچے پانی میں موجود وہ وجود ابھی بھی ساکت تھا۔ صرف پانی اسے حرکت دے رہا تھا۔ کسی پنڈولم کی طرح ...... آگے پیچھے...... آگے پیچھے...... آگے پیچھے۔

امر بیل

سین 38

جنید اپنے گھر والوں کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ رات بارہ بجے کے بعد جب اس کے گھر والے واپس گئے تو اس کے کچھ دیر بعد اس نے علیزہ کو فون کیا۔ اسی وقت سونے کے لیے اپنے کمرے میں گئی تھی۔

''میں صرف مبارک باد دینے کے لیے کال کر رہا ہوں۔'' رسمی سلام و دعا کے بعد اس نے علیزہ سے کہا۔ اس کا لہجہ خاصا خوشگوار تھا۔

''تھینکس مگر تین دن پہلے جب ہم لوگ ملے تھے تو آپ کو مجھے بتانا چاہیے تھا۔'' علیزہ نے کہا۔

''کس چیز کے بارے میں؟'' جنید نے قدرے بے نیازی سے کہا۔

''یہی کہ آپ کے گھر والے تاریخ طے کرنے کے لیے ہمارے گھر آنے والے ہیں۔''

''میں نے سوچا تمہیں سرپرائز دوں۔''

''میں سوچ رہی تھی آپ کہیں گے کہ آپ کو اس کے بارے میں کچھ خبر ہی نہیں تھی۔''

وہ دوسری طرف ہنسنے لگا ''نہیں ...... میں کوئی لڑکی نہیں ہوں کہ اسے آخری لمحوں تک کچھ پتا ہی نہ ہو اور نہ ہی یہ کوئی فلم ہے۔ ظاہر ہے میری شادی کی تاریخ مجھ سے پوچھے بغیر کیسے طے کی جا سکتی ہے۔''

''ہاں آپ سے پوچھے بغیر کیسے طے کی جا سکتی ہے۔ وہ تو صرف مجھ سے پوچھے بغیر طے کی جا سکتی ہے۔'' علیزہ نے شکوہ کیا۔

''یار! بتا تو رہا ہوں' تمہارے لیے سرپرائز تھا۔ اچھا سرپرائز نہیں تھا کیا؟'' وہ اسی طرح شگفتگی سے بولتا رہا۔

''بہار کے موسم میں شاید میں واحد آدمی ہوں گا جو اتنی خوشی خوشی اپنی رضا مندی کے ساتھ آزادی کے بجائے غلامی قبول کروں گا۔ تمہیں تو میرے اس جذبے کو سراہنا چاہیے۔'' اس بار اس کے لہجے میں مصنوعی سنجیدگی تھی۔ How very magnanimous۔

(کتنا باحوصلہ ہوں) غلامی قبول کروں گا۔''

''کیسی غلامی؟''

''نہیں شاید قید کہتے ہیں اسے ...... ہے نا؟'' جنید نے فوراً اپنے جملے میں تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں قید بھی نہیں کہتے۔''

''اچھا تو پھر کیا کہتے ہیں؟''

''میرا خیال ہے اسے بس شادی ہی کہتے ہیں۔''

''واقعی؟'' اس بار دوسری طرف سے کچھ مزید حیرانی کا اظہار کیا گیا۔

''جی واقعی .....'' وہ اس کے انداز پر مسکرائی۔

''اس میں قید یا غلامی والی کوئی بات نہیں ہوتی؟'' سنجیدگی سے تصدیق کی گئی۔

''نہیں کم از کم مردوں کے لیے ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ اگر ایسا کچھ ہو بھی تو خواتین کے لیے ہوتا ہے۔'' علیزہ نے جتانے والے انداز میں کہا۔

''اچھا ......! مگر میرے دوستوں کا تجربہ تو اس کے برعکس ہے۔'' وہ ابھی بھی اسی موڈ میں بظاہر بڑی سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔

''معجزات بھی ہوتے ہیں مگر زیادہ تر نہیں' آپ کے دوستوں کے ساتھ کوئی معجزہ ہوا ہو گا۔'' علیزہ اس کی گفتگو سے محظوظ ہو رہی تھی۔

''ہو سکتا ہے میرے معاملے میں بھی ایسا کوئی معجزہ ہو جائے؟'' دوسری طرف سے اپنے خدشے کا اظہار کیا گیا۔

''ایسے معجزوں کے لیے خواتین میں کچھ کشف اور کرامات کا ہونا ضروری ہے اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں ان دونوں چیزوں سے عاری ہوں۔''

''آپ سے یہ جان کر خاصی ہمت بندھی ہے میری' خاصا حوصلہ ہوا ہے مجھے یعنی میری آزادی پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔''

''نہیں آپ تسلی رکھیں' آپ کی آزادی پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ آپ ایسے حضرت ہیں بھی نہیں جو اپنی آزادی پر کوئی حرف برداشت کر لیں۔''

علیزہ نے اسے تسلی دی دوسری طرف سے وہ بے اختیار ہنسا۔

''Im avery timid sort of a person'' (میں تو بہت بزدل لوگوں میں سے ہوں)

''اگر آپ ''اپنے'' لیے timid (بزدل) استعمال کر رہے ہیں' تو یقیناً ڈکشنری میں timid کا مطلب بدل چکا ہوگا۔'' وہ اس کی بات پر ایک بار پھر ہنسا۔

"میرے بارے میں تم کچھ ضرورت سے زیادہ نہیں جان گئیں۔؟"

"نہیں ضرورت کے مطابق ہی جانا ہے آپ کو۔"

"تھوڑی سی رومانٹک گفتگو اب لازم نہیں ہو گئی ہم پر۔" وہ اس کے جواب سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے ابھی تک ساری گفتگو رومانٹک ہی ہوئی ہے۔"

"نہیں...... نہیں...... میں کچھ اظہار محبت اور وعدوں وغیرہ کی بات کر رہا ہوں...... چاند تارے توڑنے ٹائپ والی باتیں۔"

علیزہ ہنس پڑی "نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ان چیزوں کو توڑے بغیر بھی آپ کے بارے میں میری رائے خاصی اچھی ہے۔"

"یہ سن کر خاصی خوشی ہوئی ہے مجھے ورنہ میرا خیال تھا کہ پچھلے چند ماہ میں ہونے والے واقعات کے بعد میرے بارے میں تمہاری رائے کا گراف خاصا نیچے چلا گیا ہوگا۔" وہ اب اسے چھیڑ رہا تھا۔

"ہونا تو چاہیے تھا مگر بہر حال ہوا نہیں۔"

"تب مجھے خود کو خوش نصیب سمجھنا چاہیے"

"یہ آپ پر منحصر ہے۔" اس نے کہا وہ اب اپنی سینڈل کے اسٹیپس کھولتے ہوئے اپنے بیڈ پر بیٹھ رہی تھی۔

"یار! تمہیں بھی تو خوش قسمت سمجھنا چاہیے مجھے۔"

"اچھا ٹھیک ہے' آپ بڑے خوش قسمت ہیں۔ اب آپ یقیناً یہ کہیں گے کہ میں بھی خود کو خوش قسمت سمجھوں۔"

جنید نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

"آج تمہاری ہر (Sense) (حس) بڑی شارپ ہے۔ میرے کہے بغیر ہی اگلا جملہ بوجھ رہی ہو' کمال کی انڈراسٹینڈنگ ہے ہماری۔"

وہ اس کے آخری جملے پر مسکرائی' جنید واقعی آج بڑے موڈ میں تھا۔

"اگر آپ کے ساتھ رہنا ہے تو senses کو شارپ کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ خاصی مشکل ہو جائے گی۔"

"کس کو......؟ مجھے یا تمہیں؟"

"مجھے...... آپ کو تو خاصی آسانی ہو جائے گی۔" علیزہ نے تکیہ کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔

"You are pretty intelligent" (تم خوبصورت ذہین ہو)

جنید نے مسکراتے ہوئے اس کی بت کے جواب میں کہا۔

"آپ Pretty کے بعد کوما لگا کر یہ بات کہہ رہے ہیں" جنید اس کی بات پر بے اختیار محظوظ ہوا۔

"نہیں فل اسٹاپ لگا کر کہہ رہا ہوں you are pretty" اس بار علیزہ اس کی بات پر ہنسی۔

"اور Intelligent" اس نے ہنسی روکتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال اس کو delete کر دیتے ہیں۔ بات Pretty تک ہی رکھتے ہیں اس سے ماحول خاصا خوشگوار ہو گیا ہے۔" جنید کا اشارہ اس کی ہنسی کی طرف تھا۔

"تعریف کے لیے شکریہ ادا تو نہ کروں نا؟"

"بالکل نہیں آپ کی تعریف کر کے میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ فرض کی ادائیگی پر کیا شکریہ" جنید اب اسے تنگ کر رہا تھا۔

"اچھا تو صرف فرض کی ادائیگی کے لیے تعریف کر رہے ہیں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نہیں کر رہے۔" علیزہ مصنوعی سنجیدگی سے بولی۔

دل تو already (پہلے ہی) آپ کے پاس ہے۔ میں تو اس وقت دماغ کو استعمال کرتے ہوئے تعریف کر رہا ہوں۔

sane sensible thing (دانا اور سمجھ دار)

علیزہ نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔

"اس کی برجستگی آج واقعی لاجواب کر دینے والی تھی۔

It means that I`m going to marry a heartless person (اس کا مطلب ہے کہ ایسے شخص سے شادی کر رہی ہوں جس کا...... دل ہی نہیں ہے)

"On the contrary I`m going to marry a girl with two hearts." (اس کے برعکس میں جس لڑکی سے شادی کر رہا ہوں اس کے دو دل ہیں)

جنید نے اتنی ہی بے ساختگی سے کہا۔

"میڈیکل سائنس میں دو دلوں والے انسان کو کیا کہا جاتا ہے۔" علیزہ نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"میڈیکل سائنس کا تو مجھے پتا نہیں مگر غالب اسے "محبوب" کہتے ہیں۔"

علیزہ بے اختیار کھلکھلائی' جنید کے منہ سے غالب کا حوالہ اسے بے حد دلچسپ لگا تھا۔

"میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ بھی زندگی میں کبھی غالب کی بات کریں گے۔ اقبال کا ذکر کب فرمائیں گے؟"

"اقبال کا ذکر مشکل ہی ہے' وہ خودی کی بات کرتے ہیں اور محبت ہو جانے کے بعد

خودی کہاں باقی رہتی ہے۔ اس لیے اقبال کا ذکر اب باقی ساری زندگی مشکل ہی ہے۔ بس غالب ہی ٹھیک ہیں۔"

"وہی غالب جو کہتے ہیں کہ عشق نے نکما کر دیا؟"

"غالب تو یہ بھی فرماتے ہیں"

بلائے جان ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا' اشارت کیا' ادا کیا

"میرے سر کے اوپر سے گزر گیا ہے آپ کا یہ شعر" علیزہ نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ میرا نہیں غالب کا شعر ہے اس لیے اگر آپ کے سر کے اوپر سے گزر گیا ہے تو کوئی بات نہیں' میں اعتراض تب کرتا اگر میرا شعر آپ کے سر کے اوپر سے گزر جاتا۔"

"آپ کا اپنا شعر ہوتا تو وہ بھی میرے سر کے اوپر سے ہی گزرتا۔ لٹریچر اور خاص طور پر شعر و شاعری کے معاملے میں کچھ زیادہ اچھا ذوق نہیں رکھتی۔"

"آپ فکر نہ کریں جناب' میرے ساتھ رہیں گی تو ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"ٹھیک ہو جاؤں گی یا آپ ٹھیک کر دیں گے؟"

"دونوں میں کوئی فرق ہے؟"

"بہت ......"

"میں ٹھیک نہیں کروں گا آپ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"ابھی ٹھیک نہیں ہوں؟"

"نہیں ٹھیک ہیں مگر بعد میں کچھ زیادہ ٹھیک ہو جائیں گی یا پھر میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔" اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"صرف ٹھیک؟ زیادہ ٹھیک نہیں ہوں گے آپ؟"

اس بار وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنسا۔ "چلیں ...... زیادہ ٹھیک ہو جاؤں گا۔ آپ کی طرح غالب کے شعر میرے بھی سر کے اوپر سے گزرنے لگیں گے۔"

"آپ بڑے عجیب آدمی ہیں جنید؟"

"یہ تعریف ہے یا تنقید؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"دونوں ہی نہیں ہیں' بس تبصرہ ہے۔" علیزہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"پھر ٹھیک ہے۔ مگر آپ جب میرے گھر آ کر میرے ساتھ رہیں گی تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کی یہ رائے بہت غلط اور بے موقع تھی۔ میں بڑا سیدھا سادا آدمی ہوں۔" اس بار وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

لاحاصل

سین 39

کیتھرین نے آنکھ کھلنے پر خود کو ایک کمرے میں پایا۔ وہ کچھ دیر بستر پر پڑی اپنے اردگرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بھاگتے ہوئے وہ کمرے کے دروازے کی طرف گئی اور اس نے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ نہیں کھلا۔ وہ کھڑکی کی طرف گئی اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے پردے کھینچ دیئے چند لمحوں کے لئے وہ ہل بھی نہیں سکی۔

وہ لکڑی کے بنے ہوئے اس گھر کی دوسری منزل پر تھی اور دور دور تک کہیں بھی کوئی گھر نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی ویرانے میں آ گئی ہو مگر وہ جانتی تھی کہ وہ کسی ویرانے میں نہیں آئی۔ وہ شہر سے باہر مضافاتی علاقے کے کسی گھر میں تھی اور مسلسل ہونے والی برف باری نے اردگرد موجود تمام سبزہ ڈھک دیا تھا۔ باہر دور دور تک گرتی ہوئی برف کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"پولیس مجھے اس طرح ...... ایسی جگہ پر کیوں لے کر آئے گی۔" اسے یک دم خوف محسوس ہونے لگا واپس دروازے کی طرف جا کر اس نے زور زور سے دروازے کو دھڑ دھڑایا۔

کچھ دیر بعد اچانک اسے دروازے کے باہر چند لوگوں کے بولنے کی آواز آنے لگی۔ وہ دروازہ بجانا بند کر کے پیچھے ہٹ گئی۔ حسب توقع دروازہ کھل گیا تھا۔ اس نے تین آدمیوں کو اندر آتے دیکھا ان میں سے ایک وہی تھا جو اس کے فلیٹ پر آیا تھا۔

"تمہارا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔ مجھے یہاں پر اس طرح کیوں لے کر آئے ہو؟"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو کیتھرین! ہمارا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔" اسی آدمی نے بڑے پرسکون انداز میں کہا۔

"اور تم اس وقت لندن میں بھی نہیں ہو۔ کل تمہیں کچھ دوسری لڑکیوں کے ساتھ لیسٹر بھجوا دیا جائے گا۔ ہم لوگ کال گرلز کا ایک ریکٹ چلاتے ہیں اور اب تم ہمارے لئے کام کرو گی۔"

کیتھرین کے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔

"تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے میں کال گرل نہیں ہوں میں ......" اس آدمی نے اس کی بات کاٹ دی اور جیب سے کچھ کاغذات نکالتے ہوئے کہا

''تم کیا ہو؟'' ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیتھرین الیگزینڈر براؤن ...... عمر اٹھارہ سال دو ماہ ...... ماں کا نام روتھ براؤن۔ باپ کا نام علیم ساجد۔ وہ پاکستانی تھا۔ دو سال پہلے تمہاری ماں کا انتقال ہوا' وہ ایک بار میں کام کرتی تھی۔ اس کے بعد تم نے ایک hooker کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔''

''میں نے وہ کام چھوڑ ...... دیا ...... میں اب ...... ایک سٹور پر کام کرتی ہوں۔ میں سب کچھ چھوڑ چکی ہوں۔''

وہ اب دہشت زدہ ہو رہی تھی۔ وہ آدمی کاغذ پر نظریں جمائے بولتا رہا۔

''بہن بھائی ...... کوئی نہیں۔ رشتہ دار......'' وہ اب اس کے رشتہ داروں کی تفصیل بتا رہا تھا وہ لرزتے وجود کے ساتھ اس شخص کو بولتے سنتی رہی بہت دیر بعد وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس واقعی کیتھرین کے بارے میں ساری معلومات تھیں۔

'''''ہم تمہیں بہت اچھا معاوضہ دیں گے۔ اچھا فلیٹ ہو گا اور ......'' کیتھرین نے اس کی بات کاٹ دی۔

''دیکھیں میں hooker نہیں ہوں۔ میں اب کوئی غلط کام نہیں کرتی۔ میں بہت جلد شادی کرنے والی ہوں۔ میرا منگیتر پاکستان گیا ہے۔ چند ہفتوں کے بعد واپس آ جائے گا اور ہم دونوں۔'' اس شخص نے کرخت لہجے میں اس کی بات کاٹی۔

''مظہر خان۔ یہی نام ہے اس کا' وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا نہ ہی تمہارے ساتھ شادی کرے گا۔ اپنی مرضی سے یا زبردستی تمہیں کام وہی کرنا ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ ہم بہت اچھی طرح جانتے ہیں تمہارے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ اس لئے بہتر ہے تم ہمارے لئے کام کرو' میں دروازہ بند کر رہا ہوں اب جتنا چاہو اسے بجاؤ' یہ نہیں کھلے گا' نہ ہی تمہارا شور سن کر یہاں کوئی آئے گا۔ بہتر ہے' تم اتنی زحمت کرنے کے بجائے آرام سے بیٹھی رہو۔''

وہ شخص دوسرے دونوں آدمیوں کے ساتھ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ کیتھرین وہیں کمرے کے وسط میں کھڑی رہی۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا یہ سب اس کے ساتھ ہوا ہے۔

''اس طرح مجھے کیسے لا سکتے ہیں یہ لوگ؟ اور میرے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے جانتے ہیں؟ پولیس اور مظہر کے علاوہ تو ...... کیا مجھے؟ ...... انہیں مجھ تک کس نے پہنچایا ہے؟ میرا ایسا دشمن کون ہو سکتا ہے؟ جو ...... پچھلے آٹھ ماہ سے مظہر کے علاوہ تو میں کسی کے ساتھ بھی نہیں رہی پھر ...... اور یہ کہہ رہے ہیں کہ مظہر کو کیسے جانتے ہیں یہ......؟ کیا انہیں مظہر نے ......'' وہ کمرے میں پاگلوں کی طرح چکر کاٹتے کاٹتے رک گئی۔

''کیا مظہر نے انہیں مجھ تک پہنچایا ہے؟ کیا مظہر آٹھ ماہ سے اسی کام کے لئے مجھے ٹریپ کر رہا تھا؟ کیا وہ مجھ پر اس لئے روپیہ خرچ کرتا رہا کیا مجھے مظہر نے دھوکا دیا ہے؟ ہاں مظہر

ے علاوہ تو کوئی اور میرے اتنا قریب نہیں رہا جو یہ تک جانتا ہو کہ میرا باپ پاکستانی ہے اور اس کا م علیم ہے۔ مگر مظہر میرے ساتھ فریب کیسے کر سکتا ہے وہ تو مجھ سے محبت کرتا تھا۔ مجھے اس طرح مدل میں دھکا کیسے دے سکتا ہے؟''

کیتھرین کو رونا نہیں آیا خشک آنکھوں کے ساتھ وہ کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''اس نے مجھے برباد کر دیا اس نے مجھے مار دیا۔'' اس کے کانوں میں اپنی ماں کی شراب کے نشے میں ڈوبی ہوئی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

''اس نے مجھے تباہ نہیں کیا۔'' وہ باہر گرتی برف کو دیکھتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔

''اس نے مجھے مارا بھی نہیں' اس نے مجھے زندہ برف میں دفن کر دیا ہے اور دفن ہونے کے بعد اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مجھ پر کتنی برف گرتی ہے میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ اب یہ رف کبھی نہ پگھلے کبھی کوئی دوبارہ میرا وجود تک نہ دیکھ پائے۔ مظہر خان......'' وہ بے اختیار ہنسی اس نے کھڑکی کے شیشے پر اپنا سانس چھوڑا شیشہ دھندلا ہو گیا۔ اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو اس نے شیشے پر رکھ دیا' شیشے پر اس کے ہاتھ کا پرنٹ آ گیا۔

''تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے مظہر ......! یہ میری قسمت ہے۔ میں روتھ براؤن کی بیٹی ہوں میں کبھی کسی کی بیوی نہیں بن سکتی۔''

وہ ایک بار پھر بڑبڑا رہی تھی۔

''مجھے خدیجہ نام بہت پسند ہے۔ میں تمہارا نام خدیجہ رکھوں گا۔'' ایک سرگوشی اس کے کانوں میں لہرائی وہ ہنس پڑی۔

وہ گنگنانے لگی۔

"Jingle bells, Jingle bells jingle all the way
Santa Claus is coming along riding on the sleigh"

''تم ہنستی اچھی لگتی ہو' ہنسا کرو۔'' اس نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

''میں واپسی پر تمہارے لئے بہت سارے پاکستانی لباس لاؤں گا۔'' اس نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے ایک بار پھر کرسمس کیرل گانے کی کوشش کی۔

''ہم دونوں زندگی میں ایک بار ٹیمز میں مچھلی کا شکار ضرور کریں گے ٹھیک ہے کیتھی؟''

وہ بے تحاشا ہنسنے لگی۔ اسے اپنے گالوں پر کوئی چیز بہتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کھڑکی کے شیشے سے اس کے ہاتھ کا نشان غائب ہو چکا تھا۔ سب کچھ غائب ہو چکا تھا زندگی' محبت' تعلق رشتہ' اعتماد' خواب' امید' آرزو' روشنی' رہ جانے والی چیز برف تھی' نظر آنے والی چیز برف تھی جو ہر چیز پر گر رہی تھی' دونوں ہاتھ کھڑکی کے شیشوں پر رکھے ماتھا کھڑکی سے ٹکائے وہ اب بچوں کی طرح رو رہی تھی' برف باری اور تیز ہوتی جا رہی تھی۔

......❀......

امر بیل

سین 40

”زندگی میں ہر چیز ہر شخص' ہر فیلنگ کا Replacement (متبادل) موجود ہوتا ہے اور جو لوگ کہتے ہیں ایسا نہیں ہوتا۔ وہ بکواس کرتے ہیں۔“

کئی بار اسے عمر کی کہی ہوئی بات یاد آتی اور وہ چند لمحوں کے لیے خود کو جیسے کسی کٹہرے میں پاتی تب اس نے عمر کی بات سے اختلاف کیا تھا۔ بہت ناراض ہو کر

”آپ غلط کہتے ہیں۔ ان تینوں میں سے کسی کا بھی متبادل نہیں ہو سکتا۔ آپ جسے متبادل کہتے ہیں وہ دراصل کمپرومائز ہوتا ہے ورنہ ایک چیز ایک شخص یا ایک جذبے کے ختم ہو جانے کے بعد کوئی دوسرا اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ایک ہاتھ کٹ جائے تو کیا اس کی جگہ دوسرا ہاتھ اگ سکتا ہے؟“

اس نے اپنی جانب سے بڑی مضبوط دلیل دینے کی کوشش کی تھی۔

”بازار سے مل جاتا ہے۔ نقلی ہاتھ۔“ عمر متاثر ہوئے بغیر بولا۔

”میں اصلی ہاتھ کی بات کر رہی ہوں۔ کیا نقلی ہاتھ اس طرح کام کر سکتا ہے جس طرح اصلی ہاتھ۔“

”مگر کام تو کرتا ہے۔ اگر انسان کا دل خراب ہو جائے تو کسی دوسرے کا دل ٹرانسپلانٹ کر دیتے ہیں۔ کیا یہ Replacement نہیں ہے۔ دل سے زیادہ اہم تو جسم کا کوئی دوسرا حصہ نہیں ہے اگر اس کی Replacement ہو سکتی ہے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔“

”بات اہمیت کی نہیں ہے۔ آپ کا پوائنٹ تھا کہ ”ہر چیز“ میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ ہر چیز نہیں۔“

”سائنس ہاتھ کو Culture کرنے کی کوشش بھی کر رہی ہے۔ جس دن یہ کوشش کامیاب ہو گئی اس دن جسم کے دوسرے بہت سے حصوں کی طرح ہاتھ بھی اگا لیے جائیں گے۔ Replacement سائیکل پوری ہو جائے گی۔“ اس کے لہجے میں ہنوز اطمینان تھا۔

چیزوں کی بات چھوڑیں۔ انسانوں کی بات کریں۔ اگر کسی عورت کا شوہر مر جائے تو کیا اس کی کمی پوری ہو سکتی ہے۔ اس کی Replacement متبادل ہو سکتا ہے؟“

”بالکل ہو سکتا ہے۔“

”کیسے......؟“

”دوسرے شوہر سے۔“

”اور اگر پہلے شوہر سے اسے محبت ہو تو؟“

”دوسرے سے بھی ہو جائے گی۔“

”ایسا نہیں ہوتا۔“

”کم از کم جس دنیا میں میں رہتا ہوں' وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ فرض کرو' دوسرا شوہر ساری دنیا کی آسائش لا کر اس کے سامنے رکھے تو کیا پھر بھی اسے اس سے محبت نہیں ہو گی۔“

”میں آپ کو اپنی بات کبھی نہیں سمجھا سکتی۔ آپ ہر بات کو اور طرح سے لیتے ہیں۔“

علیزہ نے کچھ بے بس ہوتے ہوئے کہا تھا۔

”آپ کا پوائنٹ منطقی ہے ہی نہیں علیزہ بی بی یہ خواتین کی سائیکی کا حصہ ہوتا ہے Replacement پرابلم Graveyard is full of indispensable people ایسے لوگ جن کے بارے میں ہمیں خوش فہمی رہتی ہے کہ ان کا کوئی Replacement نہیں ہے۔ تو کیا دنیا ان کے بغیر بھی اسی طرح نہیں چل رہی۔ چل رہی ہے کیونکہ نیچرل سائیکل کے تحت ان کے متبادل آ گئے کچھ اور لوگ ان کی جگہ آ گئے۔ اسی کام کو کرنے کے لیے اسی رول کو سرانجام دینے کے لیے۔“

اس نے بڑی بے نیازی سے کندھے جھٹکتے ہوئے بات ختم کی تھی۔ علیزہ اس سے متفق نہیں تھی مگر وہ خاموش ہو گئی تھی۔

لاحاصل

سین 41

ایک جھٹکے کے ساتھ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا پورا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اس کا سانس بہت تیز چل رہا تھا۔ اسے ایک عجیب سی کپکپاہٹ محسوس ہوئی...... سر نیچے کیے دونوں ہاتھ بیڈ پر رکھے وہ گہرے سانس لیتی رہی۔ اس کی ناک کی نوک سے پھسلتے ہوئے پسینے کے قطرے اس کی گود میں گر رہے تھے۔

بہت سال سے دیکھا جانے والا خواب آج مکمل ہو گیا تھا...... اس نے یاد کرنے کی کوشش کی' پہلی بار اس نے یہ خواب کب دیکھا۔ دس سال پہلے' ہاں ٹھیک دس سال پہلے اس نے پہلی بار وہ سیڑھیاں اپنے قدموں کے نیچے محسوس کی تھیں...... اور اسے سمجھنے میں ناکام رہی...... یا پھر اس نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی...... اسے صرف حیرت ہوتی تھی کیا خواب بھی سلسلہ وار ہوتے ہیں۔ ایک تسلسل کے ساتھ چلتے ہوئے اس خواب نے پورا ہونے میں دس سال لئے۔

اور آج خواب کے آخری حصہ نے اسے سب کچھ سمجھا دیا...... وہ جان چکی تھی۔ وہ پچھلے دس سال سے کیا دیکھ رہی تھی۔ وہ خواب نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی لاحاصل خواہشیں دیکھ رہی تھی۔ دس سال پہلے اس نے اپنا عروج دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ دس سال بعد آج اس نے اس عروج میں چھپا ہوا زوال دیکھا تھا۔ وہ سیڑھیاں اس کی خواہشات تھیں۔ وہ روشنی اس کی ہوس تھی۔ وہ پہاڑ اس کا عروج تھا۔

اس کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ اس کا حلق جیسے کانٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے یاد آیا' وہ سونے سے پہلے ذالعید سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ مگر وہ کمرے میں نہیں آیا۔ وہ اب بھی کمرے میں نہیں تھا۔ کمرے میں مکمل تاریکی تھی وہ بیڈ کو ٹٹولتے ہوئے زمین پر جا کھڑی ہوئی۔ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ وہ تاریک کمرے میں راستہ ڈھونڈ رہی تھی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں جانا چاہ رہی ہے۔

پھر اسے یاد آیا' وہ ذالعید کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اس نے دیوار ٹٹولتے ہوئے سوئچ بورڈ ڈھونڈ کر لائٹ آن کی۔ ذالعید کا بیڈ خالی تھا۔ وہ کمرے سے باہر آ گئی۔ لاؤنج میں نائٹ بلب کی ہلکی روشنی تھی۔ وہ اندازہ نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ رات کا کون سا پہر تھا۔ وہ زینب کے کمرے میں چلی گئی۔ ذالعید وہاں نہیں تھا۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا پھر وہ ذالعید کی اسٹڈی کی طرف آ

گئی۔ اسٹڈی کی لائٹ آن تھی۔ اسٹڈی کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ ٹھٹھک گئی۔

تیز بخار کی حالت میں بھی وہ اندر سے آنے والی آواز کو پہچان سکتی تھی۔ وہ اندر رو رہا تھا بلند آواز میں...... مریم نے دروازہ کھول دیا۔ وہ کارپٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کچھ فاصلے پر میز پر قرآن شریف رکھا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ کو چھپائے ہوئے رو رہا تھا شائید اس نے قرآن پڑھنے کے بعد ماما جان کے لئے دعا کرنے کی کوشش کی ہو گی اور پھر اسے ماما جان یاد آ گئی ہوں گی اور پھر وہ......

مریم نے زندگی میں کسی مرد کو بلند آواز میں روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے آج سارا دن ذالعید کو اس طرح روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی مگر وہ رو نہیں رہا تھا اور اب وہ رات کے اس پہر وہاں اکیلا بیٹھا بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

مریم کا دل چاہا' وہ کسی خنجر سے' اپنی گردن کاٹ ڈالے...... اس نے اس شخص سے کیا چھین لیا تھا۔

زندگی میں کچھ لمحے ایسے آتے ہیں جب آپ کچرے کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور اس وقت دل یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا اپنا کچرا آپ پر پھینکے' تب آپ کا دل چاہتا ہے لوگ آپ پر تھوکیں' آپ کو گالیاں دیں' آپ پر پاؤں رکھ کر گزر جائیں اور اگر اس وقت کوئی ایسا نہ کرے تو......

وہ اس کے بالکل سامنے آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

"ذالعید!" وہ یک دم خاموش ہو گیا۔

مریم اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹانے لگی۔ ذالعید نے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔

"ذالعید! مجھے مارو' تم مجھے مارو۔" وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے پر مارنے لگی۔

ذالعید نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔

"تم مجھے گالیاں دو۔ میرے چہرے پر تھوک دو۔" وہ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی آستینوں سے چہرہ پونچھتے ہوئے اس نے میز سے قرآن اٹھایا اور اسے شیلف پر رکھ دیا۔ وہ اٹھ کر لڑکھڑاتے قدموں سے ایک بار پھر اس کے پاس آ گئی۔

"تم مجھے مار دو۔ میرا گلا دبا دو یا کم از کم ایک بار میرے چہرے پر تھوک دو۔"

"میں تمہیں مار سکتا ہوں نا تمہارے چہرے پر تھوک سکتا ہوں تمہارے چہرے کو بہت بار میری ماں نے چوما ہے۔"

وہ چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتی رہی' پھر شکست خوردگی کے عالم میں پیچھے ہٹ گئی۔ وہ وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

......❀......

سحر ایک استعارہ ہے

سین 42

نہ جانے کتنے دن گزر گئے تھے مجھے اس اندھیرے تاریک کمرے میں کچھ اندازہ ہی نہیں تھا پھر ایک دن دل چاہا وہاں سے نکلنے کو' سورج کی روشنی دیکھنے کو' اس کی حدت محسوس کرنے کو اور میں اٹھ کر باہر آ گئی تھی چند لمحوں کے لئے روشنی نے میری آنکھوں کو چندھیا دیا تھا پھر آہستہ آہستہ آنکھوں کو کھولتے ہوئے میں نے اردگرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

دور ایک کونے میں اکبر کی بیوی تندور میں روٹیاں لگا رہی تھی اور اس سے کچھ فاصلے پر اس کے بچے چوزوں کے ساتھ کھیل رہے تھے میں آہستہ آہستہ اور باہر آ گئی کچی زمین کو مٹی سے لیپا گیا تھا بہت اچھا لگا تھا مجھے اس نیم گرم زمین پر ننگے پاؤں چلنا صحن کے وسط میں آ کر میں زمین کو ٹٹولتی رہی پھر میں ٹانگیں سکیڑ کر کروٹ کے بل زمین پر لیٹ گئی۔

نیم گرم زمین نے میرے جسم کو عجیب سا سکون دیا تھا' میں اس طرح ٹانگیں سکیڑے آنکھیں بند کئے زمین پر پڑی رہی۔

''اماں چارپائی بچھا دیتی ہوں یہاں زمین پر کیوں لیٹ گئیں؟'' اکبر کی بیوی کی آواز اچانک میرے قریب ابھری تھی۔

''نہیں ٹھیک ہے۔'' میں نے نامکمل سا جواب دیا تھا کچھ دیر تک وہ اصرار کرتی رہی مگر میرے خاموش رہنے پر وہ چلی گئی تھی۔ جان گئی تھی کہ میں وہی کروں گی جو چاہتی ہوں تھوڑی دیر بعد کسی نے ایک گرم چادر مجھ پر اوڑھائی تھی میں جانتی تھی یہ اکبر کی بیوی ہی ہو گی' میں نے چادر سے اپنے چہرے اور کندھوں کو اچھی طرح ڈھانپ لیا۔

ایک عجیب سی خاموشی اور سکوت تھا ہر طرف کبھی کبھی اس خاموشی کو اکبر کے بچوں کی آوازیں توڑ دیتی تھیں مگر پھر ان کی ماں ڈانٹ کر انہیں خاموش کرا دیتی تھی۔

کیا میں نے کبھی سوچا تھا کہ میری منزل یہ ہو گی' ماربل کے فرش پر چلتے چلتے میں خاک کی زمین پر سونے لگی تھی' اگر میری زمین کا حاصل یہی ہوتا تو پھر یہ پچھلے پچیس سال کی محنت کس لئے' میں نے ان سے کیا پایا اور جو یوں ہونا تھا تو یوں ہی سہی آخر اس میں بھی برا کیا ہے کس کس کا

ماتم میں کتنی دیر مناؤں گی۔ سعد کا' ایمن کا' گھر کا یا پھر حدید کا' مجھے پھر حدید یاد آ گیا تھا' ہر بات کا سلسلہ وہیں جا کر رکتا تھا' ہر تان وہیں ٹوٹتی تھی' نہ جانے وہ کیا کر رہا ہو گا پتا نہیں اسے میرا خیال بھی آتا ہو گا کہ نہیں کبھی کبھی تو مجھے یاد کرتا ہو گا۔

میں نے ایک خوش فہمی سے خود کو بہلانا چاہا' کتنا خوش ہو گا وہ ایمن کے ساتھ' اس کی یہ کمی بھی پوری ہو گئی تھی' میں واقعی احمق تھی جو یہ سمجھتی رہی کہ میں نے اس کی ہر کمی پوری کر دی ہے اب وہ میرے علاوہ کسی کے بارے میں سوچتا ہی نہیں ہو گا' مگر ایسا نہیں تھا میں نے چہرے پر سے چادر ہٹائی۔

''ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔'' کسی کی آواز میرے پاس گونجی تھی میں نے پھر چادر سے چہرے کو ڈھانپ لیا' کوئی میرے قریب آیا تھا پھر کسی نے میرے پیروں پر ہاتھ رکھا تھا' میں نے سوچا یہ اکبر کا چھوٹا بیٹا ہو گا وہ اکثر پیروں سے ہی کھیلتا تھا' میں نے اسے روکا نہیں بس اسی طرح لیٹی رہی پھر کسی نے اچانک میرے پیروں کو چومنا شروع کر دیا' میں ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

میرے پیروں پر گھٹنوں کے بل جھکا ہوا شخص حدید تھا صرف ایک لمحے کے لئے میں ساکت ہوئی تھی' پھر تیزی سے میں نے اپنے پیر کھینچ لئے وہ سیدھا ہو گیا' میری اور اس کی نظریں ٹکرائیں تھیں بہت عجیب سی کیفیت تھی اس کی آنکھوں میں۔

''آپ کہاں چلی گئی تھیں مجھے اس طرح چھوڑ کر۔''

میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر اٹھنے کی کوشش کی اس نے مجھے روکنے کے لئے میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا مگر میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''مجھے ہاتھ نہ لگاؤ تم میرے لگتے کیا ہو۔'' میں غرائی اور وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہو گیا تھا بہت بے یقینی کے عالم میں اس نے مجھے دیکھا' میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ کو ہوا کیا ہے؟'' وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''میں پاگل ہو گئی ہوں۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے اندر جانے کی کوشش کی تھی۔

''ممی۔'' میں اس کی بات پر بھڑک اٹھی تھی۔

''مجھے ممی مت کہو' تمہاری ماں نہیں ہوں' تم سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے تمہاری ماں وہ ہے جس کے لئے تم نے مجھے طلاق دلوا دی۔''

''آپ کیا کہہ رہی ہیں مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔''

میں نے جواب دیئے بغیر اندر جانے کی کوشش کی مگر اس نے میرے بازو پکڑ لئے۔

''آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہیں کیا غلط فہمی ہو گئی ہے آپ کو میرے خلاف۔''

وہ میرے بازو پکڑے گڑگڑا رہا تھا مگر میں اس کی کوئی بات سننا نہیں چاہتی تھی نہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ میں خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتی رہی مگر اس نے مجھے بہت مضبوطی

سے پکڑا ہوا تھا میں کسی طرح بھی اس سے خود کو نہیں چھڑا پا رہی تھی۔

ایک عجیب سی ہیجانی کیفیت مجھ پر سوار ہوگئی تھی پتا نہیں کیا ہوا کہ میں نے خود کو چھڑانا بند کر دیا اور پھر پتا نہیں کیسے میں اسے مارنے لگی تھی میں نے اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ بے یقینی کی ایک عجیب سی کیفیت تھی اس کے چہرے پر مگر اس نے مجھے چھوڑا نہیں نہ ہی مجھے روکنے کی کوشش کی بس خاموشی سے مار کھاتا رہا۔

میرا دل چاہ رہا تھا میں اس کی خوب صورت شکل بگاڑ دوں وہ چہرہ جو ہمیشہ مجھے ایمن کی یاد دلاتا تھا میں اس چہرے کو مٹا دینا چاہتی تھی اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا' ناک میں سے خون نکلنے لگا تھا چہرے پر جابجا میرے ناخنوں سے پڑنے والی خراشیں نظر آ رہی تھیں قمیض کے بٹن ٹوٹ گئے تھے مگر وہ بڑی ثابت قدمی سے اسی طرح مجھے پکڑے ہوئے مار کھاتا رہا۔

صحن میں اکبر سمیت اس کا پورا خاندان کھڑا تھا' دیوار پر ہمسایوں کی کچھ عورتیں جھانک رہی تھیں وہ سب بے حس و حرکت یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں نے اسے بہت مارا تھا' بہت گالیاں دی تھیں وہ سب جو پچھلے 25 سال سے میرے اندر جمع ہو گیا تھا وہ میں اس دن نکال رہی تھی وہ سب جو میں دوسروں سے کہنا چاہتی تھی وہ میں نے اسے کہہ دیا تھا۔

اسے مارتے مارتے میرے ہاتھ دکھنے لگے تھے۔ میری ساری ہمت جواب دے گئی تھی اس کا چہرہ دیکھنے کی ہمت مجھ میں نہیں رہی تھی میں نے پوری زندگی اسے سخت ہاتھ نہیں لگایا تھا اب میں اسے مار رہی تھی' آخر میرے ہاتھ رک گئے' میں بلک بلک کر رونے لگی۔ اس نے میرے بازو چھوڑ دیئے اور میں جیسے زمین پر ڈھے گئی تھی اس نے اپنا جوتا اتار کر میرے ہاتھوں میں تھمانے کی کوشش کی تھی۔

''اور مارنا چاہیں تو اس سے ماریں۔'' اس نے کہا تھا میں نے جوتے کو پرے دھکیل دیا اور چیخیں مار مار کر رونے لگی تھی' اس نے مجھے چپ کروانے کی کوشش نہیں کی پتہ نہیں میں کتنی دیر تک روتی رہی تھی۔ جب آنسو نکلنا ختم ہو گئے اور میں نے آنکھیں کھول کر اٹھنے کی کوشش کی تھی تو اسے اپنے پاس پایا تھا' اس نے سہارا دے کر مجھے اٹھایا تھا میں نے اسے روکا نہیں صحن میں اب کوئی بھی نہیں تھا' نہ ہی دیواروں پر عورتیں تھی پتا نہیں سب کہاں چلے گئے تھے۔

حدید اٹھ کر نل کے پاس چلا گیا تھا پھر ایک گلاس میں وہ پانی لایا تھا' مجھے گلاس تھمانے کے بجائے اس نے گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پیا تھا۔

''بس۔'' میں نے گلاس کو ہاتھ سے پرے کیا تھا اس نے باقی پانی خود پی لیا تھا' پھر اس نے میرے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر لپیٹ دیا تھا اور کچھ فاصلے پر پڑی ہوئی چادر لا کر مجھے اوڑھا دی میں بغیر کسی مزاحمت کے ایک مجسمے کی طرح بیٹھی رہی۔

کوئی بات ہے تیری بات میں

سین 43

اگلے دن وہ پھر سہ پہر کو ہی آئی تھی۔ وہ بمشکل سیڑھیوں سے نیچے اتر کر دروازہ کھولنے آیا تھا۔ دروازہ کھول کر اس نے اسے راستہ دیا اور خود لاؤنج کی ایک چیئر کھینچ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس دن وہ پہلے کی طرح اس کے ساتھ دادی کے کمرے میں نہیں گیا تھا۔ اسے پاؤں میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند کیے کرسی پر جھولتے ہوئے اس نے اچانک مریم کی آواز سنی تھی۔

''ارے آپ کے پاؤں کو کیا ہو گیا'' اس نے واپسی پر اس کے پاؤں پر بندھی ہوئی پٹی پر نظر پڑتے ہی پوچھا تھا۔ اس نے اس کی آواز پر آنکھیں کھول دیں۔ مریم نے اب غور سے اس کا چہرہ دیکھا تھا جو بہت زرد تھا شاید اسے بخار بھی تھا۔

''nothing serious بلاوجہ ہی کل رات کو میں لان میں پھر رہا تھا کسی insect (کیڑے) نے کاٹ لیا''۔

وہ بے اختیار اس کے قریب چلی آئی ...... پر تاسف نظروں سے اس کے پاؤں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے کہا۔

''پاؤں سوج گیا ہے نا......؟''

''ہاں کافی زیادہ ...... میں ایسے ری ایکشن کی توقع نہیں کر رہا تھا پھر اوپر سے بخار بھی ہو گیا ہے'' وہ واقعی کافی تکلیف میں اور تھکا ہوا تھا۔

''میں آپ کو کچھ لکھ کر دیتی ہوں آپ اسے پانی میں ڈال کر اس وقت تک پانی پیتے رہیں جب تک کہ پاؤں ٹھیک نہیں ہو جاتا''۔

''What؟''

وہ اس کی پیشکش پر بری طرح حیران ہوا تھا۔

''آپ ایسا کیا لکھیں گی جسے پی کر میں ٹھیک ہو جاؤں گا''۔

''آپ گھبرائیں نہیں میں آپ کو کچھ قرآنی آیات لکھ کر دوں گی اس کاغذ کو پانی میں بھگو کر پینے سے آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ بھی ایک طریقہ علاج ہے۔''

مریم نے جیسے اسے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے بڑی غیر دلچسپی سے اس کی بات سنی اور بڑی بے رخی سے اس پیشکش کو ٹھکرایا۔

''تھینک یو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر سے بینڈیج کروا چکا ہوں اور کچھ میڈیسن بھی لی ہے۔ امید ہے شام تک میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ ویسے بھی میں اس قسم کی چیزوں پر believe نہیں کرتا''۔

اس کے لہجے میں وہی فطری اکھڑپن تھا لیکن اس نے برا مانے بغیر کہا:

''پتا ہے پچھلے سال میرے ہاتھ پر بھی کسی کیڑے نے کاٹ لیا تھا'' اس نے اپنی کلائی اس کے آگے کی تھی جس پر ایک مدھم سا نشان تھا۔

''میرا تو پورا بازو کہنی تک سوج گیا تھا اور ٹھیک ہونے کو ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بھی بہت سے ڈاکٹرز کو دکھایا تھا۔ پھر کسی نے مجھے آیات لکھ کر دی تھیں اور میں وہی پانی پی کر ٹھیک ہو گئی تھی۔ بعد میں تو مجھے کسی میڈیسن کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔''

وہ بڑے رسان سے اسے بتا رہی تھی اور وہ اتنا ہی اکتایا ہوا بیٹھا تھا۔ اس لئے فوراً بول اٹھا۔

''آپ نے کسی کوالیفائیڈ ڈاکٹر کو نہیں دکھایا ہوگا اسی لئے ٹھیک ہونے میں اتنی دیر لگی''۔

ایک لمحہ کے لئے وہ چپ رہی تھی اور پھر اس کے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

''جی نہیں ...... میں نے کوالیفائیڈ ڈاکٹروں کو ہی دکھایا تھا۔ دنیا میں یہ سہولت صرف آپ ہی کو میسر نہیں ہے اور بھی بہت سے لوگ ہیں''۔ یک دم وہ اسی پرانے تکلف کے ماحول میں سمٹ گئی تھی۔ مزید کچھ کہے بغیر اس نے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیا۔ اور اسے عجیب سا پچھتاوا ہوا تھا۔ اس کی خفگی اسے بے حد عجیب اور بے حد اچھی لگی تھی۔

''آپ تو ناراض ہو گئیں ...... میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ بہت سے ڈاکٹرز ٹھیک طرح سے ایسی چیزوں کو ٹریٹ نہیں کر پاتے you know یہ کوئی اتنی کامن چیز نہیں ہے''۔

مریم نے چند لمحوں کے لئے رک کر اسے دیکھا اور پھر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس نے اس کی وضاحت تسلیم نہیں کی تھی۔

''دیکھیں آپ کیا مجھے وہ verses (آیات) لکھ کر نہیں دیں گی'' اس بار وہ بے اختیار رک گئی تھی اور اس کی طرف مڑ کر اس نے پوچھا:

''لیکن آپ تو ایسی چیزوں پر یقین ہی نہیں کرتے۔''

''ہاں کرتا تو نہیں but let`s try ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آخر آپ نے اسے پرسنلی آزمایا ہے۔''

اس نے یہ بات صرف اسے خوش کرنے کے لئے کہی تھی ورنہ وہ مکمل طور پر غیر سنجیدہ تھا۔ اور حسب توقع وہ خوش ہو گئی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے میں لکھ دیتی ہوں...... میں اس سیپارے کو کہاں رکھوں؟''

اس نے بک شیلف کی طرف اشارہ کیا۔

''اسے وہاں رکھ دو''۔

''پیپر اور پین کہاں ملے گا؟'' یہ اس کا اگلا سوال تھا۔

''فون کے پاس جو کٹ ہے اس میں دیکھ لو'' اس نے اسی طرح چیئر پر بیٹھے بیٹھے ہدایات دیں۔ وہ وہاں سے پیپر اور پین لے کر اس کے پاس چلی گئی اور لاؤنج کے ٹیبل کے قریب کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

''آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں' وہاں صوفہ پر بیٹھ جائیں''۔ اس نے مریم کو کارپٹ پر بیٹھتے دیکھ کر کہا۔ اب اسے اس ساری مصروفیات میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

''نہیں ...... میں یہاں ٹھیک ہوں'' اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دے کر ڈائری ٹیبل پر رکھ دی اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ایک ہاتھ ڈائری پر جمائے اور ٹیبل پر جھک کر بڑی احتیاط سے کچھ لکھنے لگی۔ اسے یہ پوز بہت دلچسپ لگا تھا۔ اس وقت وہ ایک ایسے سٹوڈنٹ کی طرح لگ رہی تھی جو سالانہ امتحان میں پرچہ سوالات دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے اسے حل کرنے کی فکر میں ہوتا ہے۔ وہ لکھنے کے ساتھ کچھ پڑھ بھی رہی تھی۔ اور وہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ پہلے کا ناقابل برداشت درد اب جیسے ختم ہو گیا تھا۔ پھر اچانک اس نے اس کی خاموشی توڑنے کے لئے پوچھا۔

''آپ لکھ کیا رہی ہیں......'' جواب میں اس نے سر اٹھا کر اس طرح منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا اور دوبارہ کاغذ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ جیسے دھک سے رہ گیا تھا۔ اس کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ کچھ عجیب سی بات تھی اس لڑکی میں جسے وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ اسے اس وقت وہ بہت عجیب سی چیز لگی تھی۔ بے اختیار اس کا دل چاہا تھا کہ وہ ہمیشہ یونہی اس کے سامنے رہے۔ ایسا کب ہوا تھا کہ اس نے کسی کی ناراضگی دور کرنے کی کوشش کی ہو۔ ایسا کب ہوا تھا کہ اس نے کسی سے اتنی نرمی برتی ہو۔ لیکن اس وقت وہ بے اختیار یہ سب کر رہا تھا۔ شاید وہ وقت ہی کچھ انہونیوں کا تھا۔

چند منٹوں کے بعد اس نے اپنا کام ختم کر دیا۔ پھر کاغذ پر پھونک مارتے ہوئے اسے تہ کرنے لگی۔ پھر وہ کارپٹ سے اٹھ کر اس کی طرف آئی تھی۔

''آپ وضو کر کے اسے پانی کی بوتل میں ڈال لیں اور جب بھی پیاس لگے وہی پانی

پئیں۔ جب پانی ختم ہو جائے تو بوتل میں اور پانی بھر لیں۔"

"دیکھیں میں نے اس وقت وضو نہیں کیا اور نہ ہی مجھے وضو کرنا آتا ہے" بڑے اسٹریٹ فارورڈ سے انداز میں اس نے مریم سے کہا تھا۔ اس نے اس کی بات پر کاغذ والا ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔

"دوسری بات یہ کہ میں یہاں کا پانی نہیں پیتا ہوں کیونکہ وہ مجھے سوٹ نہیں کرتا۔ میں یا تو ڈسٹلڈ واٹر پیتا ہوں کیونکہ وہ مجھے سوٹ نہیں کرتا۔ میں یا تو ڈسٹلڈ واٹر پیتا ہوں یا منرل' اب آپ بتا دیں کہ اسے کون سے پانی میں ڈال کر پیوں۔ بلکہ آپ ایسا کریں کہ کچن میں چلیں وہاں پانی کی باٹلز ہیں آپ خود ہی ان میں ڈال دیں"۔

وہ اٹھتے ہوئے بولا تھا۔ مریم خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ آہستہ آہستہ لنگڑاتے ہوئے وہ اسے کچن میں لے آیا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ کچن کی لائٹ جلا کر اس نے ریفریجریٹر کھولا اور اس میں سے منرل واٹر کی ایک بوتل نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ مریم نے بوتل لے کر اس کی سیل توڑی اور اسے کھول کر وہ کاغذ اس میں ڈال دیا پھر بوتل بند کر کے ایک دفعہ اسے ہلایا اور واپس اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ اتنی دیر میں ریفریجریٹر سے جوس کے دو پیک برآمد کر چکا تھا۔

"آپ نے میرے لئے اتنا وقت ضائع کیا ہے تو پلیز تھوڑی دیر اور بیٹھ جائیں اور جوس پی کر جائیں"۔

"نہیں تھینک یو مجھے اب جانا ہے بہت دیر ہو گئی ہے"۔ اس نے کچن سے قدم باہر بڑھا دیئے۔ وہ بھی اس کے پیچھے باہر نکل آیا۔ بوتل کو کھول کر وہ پانی کے چند گھونٹ لے رہا تھا جب اس کے آگے آگے چلتی ہوئی مریم کچھ کہنے کے لئے مڑی تھی اور اسے یوں پانی پیتے دیکھ کر ناگواری کی ایک لہر سی اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی۔

"اس کو اس طرح تو نہیں پیتے" کافی خفگی سے اسے ٹوکا گیا۔ وہ بوتل بند کرتے کرتے رک گیا۔

"تو کیسے پیتے ہیں؟" چند لمحے وہ اس کے سوال پر اسے گھورتی رہی پھر مڑ کر کچن میں چلی گئی وہ اس کے پیچھے آیا تھا۔ گلاس اسٹینڈ سے اس نے ایک گلاس لیا اور اس کے قریب چلی آئی۔

"یہ باٹل مجھے دیں" اس نے خاموشی سے بوتل اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے ڈائننگ ٹیبل پر گلاس رکھ کر اس میں پانی انڈیلا۔ گلاس کو آدھا بھرنے کے بعد اس نے ایک کرسی کھینچی اور اسے مخاطب کیا۔

"اب آپ یہاں بیٹھ کر بسم اللہ پڑھ کر یہ دعا کریں کہ اللہ مجھے اس تکلیف اور آزمائش

سے نجات دے اور پھر یہ پانی تین گھونٹ میں پی لیں"۔ وہ اس کے کہنے پر چیئر پر بیٹھ گیا لیکن بسم اللہ نہیں پڑھ سکا۔ وہ شاید سمجھ گئی تھی اس لئے اس نے اسے بسم اللہ پڑھ کر سنائی تھی۔ جھجکتے ہوئے اس نے بھی بسم اللہ پڑھ لی تھی اور اچانک اسے پتا چلا تھا کہ وہ بسم اللہ بھی بھول چکا تھا۔ پھر اسی کے ساتھ ساتھ وہ دعا دہرائی تھی۔

"اب آپ دائیں ہاتھ سے گلاس پکڑ کر آہستہ آہستہ پانی پی لیں' وہ اس کے پاس کھڑی اسے انسٹرکشنز دے رہی تھی اور وہ کسی معمول کی طرح ان پر عمل کر رہا تھا۔

"یہ کوئی عام پانی یا مشروب نہیں ہے جسے آپ چلتے پھرتے ایسے ہی پیتے رہیں۔ اسے پینے کے کچھ آداب ہیں ...... اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ واقعی ٹھیک ہو جائیں تو اسے اس طرح پیا کریں جیسے میں نے بتایا ہے ورنہ آپ کا پاؤں ٹھیک نہیں ہوگا"۔

اس نے جیسے اسے ڈرایا تھا۔ پھر وہ لاؤنج میں چلی آئی اور اپنا سیپارہ لے کر چلی گئی۔ وہ واپس کمرے میں جانے کی بجائے وہیں لاؤنج میں چلا آیا۔ واپس کمرے میں جاتا تو تھوڑی دیر بعد جب وہ سیپارہ واپس کرنے آتی تو اسے دوبارہ نیچے آنا پڑتا اور وہ اس ڈرل کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اسی لئے اس کے انتظار میں وہیں بیٹھ گیا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آئی تھی اور اسے دیکھتے ہی اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا:

"اب آپ کو کیسا محسوس ہو رہا ہے"۔

"ویل ...... مجھے تو کوئی فرق محسوس نہیں ہوا ...... ابھی تک ویسے ہی درد ہے"۔

بڑی صاف گوئی سے اس نے جواب دیا تھا۔

"اچھا......" وہ جیسے بجھ گئی تھی پھر شاید اس نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔

"کوئی بات نہیں اتنی جلدی درد ٹھیک نہیں ہو سکتا نا ...... ابھی تو تھوڑا سا وقت ہی گزرا ہے"۔

پھر وہ سیپارہ اندر رکھ کر واپس چلی گئی۔

پیرِ کامل

سین 44

''مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں اس لئے تمہیں بلوایا ہے۔'' سکندر نے مسکراتے ہوئے سالار کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ طیبہ کے ساتھ اس وقت لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے اور سالار ان کے فون کرنے پر اس ویک اینڈ پر اسلام آباد آیا ہوا تھا۔

سکندر عثمان نے قدرے ستائشی نظروں سے اپنے تیسرے بیٹے کو دیکھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ان کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد اب کپڑے تبدیل کر کے ان کے پاس آیا تھا۔ سفید شلوار قمیض اور گھر میں پہنی جانے والی سیاہ چپل میں وہ اپنے عام سے حلیے کے باوجود بہت باوقار لگ رہا تھا۔ شاید یہ اس کے چہرے کی سنجیدگی تھی یا پھر شاید وہ آج پہلی بار کئی سالوں کے بعد اسے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے اور وہ اعتراف کر رہے تھے کہ اس کی شخصیت میں بہت وقار اور ٹھہراؤ آ گیا ہے۔

انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ سالار کی وجہ سے انہیں اپنے سوشل سرکل میں اہمیت اور عزت ملے گی۔ وہ جانتے تھے بہت جگہوں پر اب ان کا تعارف سالار سکندر کے حوالے سے ہوتا تھا اور انہیں اس پر خوشگوار حیرت ہوتی تھی۔ اس نے اپنی پوری ٹین ایج میں انہیں بری طرح خوار اور پریشان کیا تھا اور ایک وقت تھا' جب انہیں اپنے اس بیٹے کا مستقبل سب سے تاریک لگتا تھا۔ اپنی تمام غیر معمولی صلاحیتوں اور قابلیت کے باوجود مگر ان کے اندازے اور خدشات صحیح ثابت نہیں ہوئے تھے۔

طیبہ نے خشک میوے کی پلیٹ سالار کی طرف بڑھائی۔

سالار نے چند کاجو اُٹھا لئے۔

''میں تمہاری شادی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

کاجو منہ میں ڈالتے ہوئے وہ ایک دم رک گیا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ سکندر عثمان اور طیبہ بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔

''اب تمہیں شادی کر ہی لینی چاہئے سالار!''

سکندر نے کہا۔ سالار نے غیر محسوس انداز میں ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاجو دوبارہ خشک ے کی پلیٹ میں رکھ دیئے۔

''میں اور طیبہ تو حیران ہو رہے تھے کہ اتنے رشتے تو تمہارے بھائیوں میں سے کسی کے یں آئے جتنے تمہارے لئے آ رہے ہیں۔''

سکندر نے بڑے شگفتہ انداز میں کہا۔

''میں نے سوچا' کچھ بات وات کریں تم سے۔''

وہ چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔

''زاہد ہمدانی صاحب کو جانتے ہو۔'' سکندر عثمان نے ایک بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کے ہیڈ کا نام لیا۔

''جی...... ان کی بیٹی میری کولیگ ہے۔''

''رمشہ نام ہے شاید؟''

''جی۔''

''کیسی لڑکی ہے؟''

وہ سکندر عثمان کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ ان کا سوال بہت ''واضح'' تھا۔

''اچھی ہے۔'' اس نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

''تمہیں پسند ہے؟''

''کس لحاظ سے؟''

''میں رمشہ کے پرپوزل کی بات کر رہا ہوں۔'' سکندر عثمان نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''زاہد پچھلے کئی ہفتے سے مجھ سے اس سلسلے میں بات کر رہا ہے۔ اپنی وائف کے ساتھ وہ ایک دو بار ہماری طرف آیا بھی ہے۔ ہم لوگ بھی ان کی طرف گئے ہیں۔ پچھلے ویک اینڈ پر رمشہ سے بھی ملے ہیں۔ مجھے اور طیبہ کو تو بہت اچھی لگی ہے۔ خوب صورت ہے' بہت well behaved ہے اور تمہارے ساتھ بھی اس کی اچھی خاصی دوستی ہے۔ ان لوگوں کی خواہش ہے بلکہ اصرار ہے کہ تمہارے ذریعہ دونوں فیملیز میں کوئی رشتہ داری بن جائے۔''

''پاپا! میری رمشہ کے ساتھ دوستی نہیں ہے۔'' سالار نے مدھم اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''وہ میری کولیگ ہے' جان پہچان ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت اچھی لڑکی ہے مگر میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

"تم کہیں اور انٹرسٹڈ ہو؟"

سکندر نے اس سے پوچھا۔ وہ خاموش رہا۔ سکندر اور طیبہ کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔

"اگر تمہاری کہیں اور دلچسپی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں بلکہ ہمیں خوشی ہو گی وہاں تمہاری شادی کی بات کرتے ہوئے اور یقیناً ہم تم پر بھی کوئی دباؤ نہیں ڈالیں گے اس سلسلے میں۔"

سکندر نے نرمی سے کہا۔

"میں بہت عرصہ پہلے شادی کر چکا ہوں۔"

ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔ سکندر کو کوئی دشواری نہیں ہوئی یہ سمجھنے میں کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ ان کے چہرے پر یک دم سنجیدگی آ گئی۔

"امامہ کی بات کر رہے ہو؟"

وہ خاموش رہا۔ سکندر بہت دیر تک بے یقینی سے اسے دیکھتے رہے۔

"اتنے عرصے سے اس لئے شادی نہیں کر رہے؟"

سکندر کو جیسے ایک شاک لگا تھا۔ ان کا خیال تھا وہ اسے بھلا چکا تھا۔ آخر یہ آٹھ سال پرانی بات تھی۔

"اب تک تو وہ شادی کر چکی ہو گی' اپنی زندگی آرام سے گزار رہی ہو گی۔ تمہاری اور اس کی شادی تو کب کی ختم ہو چکی۔"

سکندر نے اس سے کہا۔

"نہیں پاپا! اس کے ساتھ میری شادی ختم نہیں ہوئی۔" اس نے پہلی بار سر اٹھا کر کہا۔

"تم نے اسے نکاح نامے میں طلاق کا اختیار دیا تھا اور...... مجھے یاد ہے تم اسے ڈھونڈنا چاہتے تھے تاکہ طلاق دے سکو۔"

سکندر نے جیسے اسے یاد کروایا۔

"میں نے اسے ڈھونڈا تھا مگر وہ مجھے نہیں ملی اور وہ یہ بات نہیں جانتی کہ اس کے پاس طلاق کا اختیار ہے۔ وہ جہاں بھی ہو گی ابھی تک میری ہی بیوی ہو گی۔"

"سالار! آٹھ سال گزر چکے ہیں۔ ایک دو سال کی بات تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ یہ جان گئی ہو کہ طلاق کا اختیار اس کے پاس ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اب بھی تمہاری بیوی ہی ہو۔"

سکندر نے قدرے مضطرب ہو کر کہا۔

"میرے علاوہ کوئی دوسرا تو اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا اور میں نے اسے اس حق کے بارے

میں نہیں بتایا اور جب تک وہ میرے نکاح میں ہے مجھے کہیں اور شادی نہیں کرنی۔"

"تمہارا کانٹیکٹ ہے اس کے ساتھ۔" سکندر نے بہت مدھم آواز میں کہا۔

"نہیں۔"

"آٹھ سال سے اس سے تمہارا رابطہ نہیں ہوا۔ اگر ساری عمر نہ ہوا تب تم کیا کرو گے؟"

وہ خاموش رہا۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

سکندر عثمان کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرتے رہے۔

"تم نے مجھ سے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم اس لڑکی کے ساتھ ایموشنلی انوالوڈ ہو۔ تم نے تو مجھے یہی بتایا تھا کہ تم نے صرف وقتی طور پر اس کی مدد کی تھی وہ کسی اور لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھی وغیرہ وغیرہ۔"

سالار اس بار بھی خاموش رہا۔

سکندر عثمان چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔ وہ اپنے اس تیسرے بیٹے کو کبھی نہیں جان سکے تھے۔ اس کے دل میں کیا تھا وہ اس تک کبھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ جس لڑکی کے لئے وہ آٹھ سال ضائع کر چکا تھا اور باقی کی زندگی ضائع کرنے کے لئے تیار تھا' اس کے ساتھ اس کے جذباتی تعلق کی شدت کیسی ہو سکتی تھی یہ اب شاید اسے لفظوں میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کمرے میں خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا پھر سکندر عثمان اٹھ کر اپنے ڈریسنگ روم میں چلے گئے۔ ان کی واپسی چند منٹوں کے بعد ہوئی۔ صوفہ پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے سالار کی طرف ایک لفافہ بڑھا دیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے وہ لفافہ پکڑ لیا۔

"امامہ نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔"

وہ سانس نہیں لے سکا۔ سکندر عثمان ایک بار پھر صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔

"یہ پانچ چھ سال پہلے کی بات ہے وہ تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔" فون ناصرہ نے اٹھایا تھا اور اس نے امامہ کی آواز پہچان لی۔ "تب تم پاکستان میں تھے' ناصرہ نے تمہاری بجائے مجھ سے اس کی بات کروائی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے اس کی بات کرواؤں۔ میں نے اس سے کہا کہ تم مر چکے ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ تم سے رابطہ کرے اور جس مصیبت سے ہم چھٹکارا پا چکے ہیں اس میں دوبارہ پڑیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری بات پر یقین کر لے گی کیونکہ تم کئی بار خودکشی کی کوشش کر چکے تھے۔ وہ وسیم کی بہن تھی تمہارے بارے میں یہ سب کچھ جانتی ہو گی۔ کم از کم ایک ایسی کوشش کی تو وہ خود گواہ تھی۔ میں اسے نکاح نامے میں موجود طلاق کے اختیار کے بارے میں نہیں بتا سکا نہ ہی اس طلاق نامے کے بارے میں جو میں نے تمہاری طرف سے تیار کروایا تھا۔ تمہیں جب میں نے امریکہ بھجوایا تھا تو تم سے ایک سادہ کاغذ پر سگنیچرز لئے تھے' میں چاہتا تھا کہ

مجھے ضرورت پڑے تو میں خود ہی طلاق نامہ تیار کروا لوں۔ یہ قانونی یا جائز تھا کہ نہیں اس کا پتہ نہیں مگر میں نے اسے تیار کروا لیا تھا اور میں امامہ کو اس کے بارے میں بتانا چاہتا تھا اور اسے تمام پیپرز بھی دینا چاہتا تھا مگر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے نمبر ٹریس آؤٹ کروایا وہ کسی پی سی او کا تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد بیس ہزار کے کچھ ٹریولرز چیک مجھے اس نے ڈاک کے ذریعے بھجوائے اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ شاید تم نے اسے کچھ رقم دی تھی۔ اس نے وہ واپس کی تھی۔ میں نے تمہیں اس لئے نہیں بتایا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم دوبارہ اس معاملے میں انوالو ہو۔ میں امامہ کی فیملی سے خوفزدہ تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ تب بھی تمہاری تاک میں ہوں گے اور میں چاہتا تھا تم اپنا کیریئر بناتے رہو۔"

وہ لفافہ ہاتھ میں پکڑے رنگ بدلتے ہوئے چہرے کے ساتھ سکندر عثمان کو دیکھتا رہا' کسی نے بہت آہستگی کے ساتھ اس کے وجود سے جان نکال لی تھی۔ اس نے لفافے کو ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ طیبہ اور سکندر اس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ کو دیکھ سکیں ...... وہ دیکھ چکے تھے مگر اس کے حواس چند لمحوں کے لئے بالکل کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔ اپنے سامنے پڑی ٹیبل پر رکھے اس لفافے پر ہاتھ رکھے وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اسے ٹیبل پر رکھے رکھے اس نے اس کے اندر موجود کاغذ کو نکال لیا۔

ڈیئر انکل سکندر!

مجھے آپ کے بیٹے کی موت کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا۔ میری وجہ سے آپ لوگوں کو چند سال پہلے بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا' میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے سالار کو کچھ رقم ادا کرنی تھی۔ وہ میں آپ کو بجھوا رہی ہوں۔

خدا حافظ

امامہ ہاشم

سالار کو لگا وہ واقعی مر گیا ہے۔ سفید چہرے کے ساتھ اس نے کاغذ کے اس ٹکڑے کو دوبارہ لفافے میں ڈال دیا۔ کچھ بھی کہے بغیر اس نے لفافہ تھاما اور اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ سکندر اور طیبہ دم بخود اسے دیکھ رہے تھے جب وہ سکندر کے پاس سے گزرنے لگا تو وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"سالار......!"

وہ رک گیا۔ سکندر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"جو کچھ بھی ہوا ...... نادانستگی میں ہوا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم ...... اگر تم نے کبھی مجھے امامہ کے بارے میں اپنی فیلنگز بتائی ہوتیں تو میں کبھی یہ سب نہ کرتا۔ میں اس سارے معاملے کو کسی اور طرح ہینڈل کرتا یا پھر اس کے ساتھ تمہارا رابطہ کروا دیتا۔ میرے بارے میں اپنے دل میں کوئی

شکایت یا گلہ مت رکھنا۔"

سالار نے سر نہیں اُٹھایا۔ ان سے نظر نہیں ملائی مگر سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ اسے ان سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ سکندر نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا لیا۔

وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا' سکندر چاہتے تھے وہ وہاں سے چلا جائے۔ انہوں نے اس کے ہونٹوں کو کسی بچے کی طرح کپکپاتے دیکھا تھا۔ وہ بار بار انہیں بھینچ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند منٹ اور وہاں رہتا تو شاید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ سکندر اپنے پچھتاوے میں مزید اضافہ نہیں چاہتے تھے۔

طیبہ نے اس ساری گفتگو میں کوئی مداخلت نہیں کی' مگر سالار کے باہر جانے کے بعد انہوں نے سکندر کی دل دہی کرنے کی کوشش کی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا اس کی بہتری کے لئے کیا۔ وہ سمجھ جائے گا۔"

وہ سکندر کے چہرے سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکتی تھیں۔ سکندر ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کمرے میں چکر لگا رہے تھے۔

"یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ مجھے سالار سے پوچھے بغیر یا اس کو بتائے بغیر یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مجھے امامہ سے اس طرح کا جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہئے تھا...... مجھے......"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر تاسف آمیز انداز میں ایک ہاتھ کو مٹھی کی صورت میں بھینچے ہوئے کھڑکی میں جا کر کھڑے ہو گئے۔

لاحاصل

سین 45

وہ چوتھے دن ایک بار پھر کاؤنٹر کے دوسری طرف کھڑا تھا۔ خدیجہ اس وقت بھی ایک کسٹمر کو ڈیل کر رہی تھی۔ اس دن اس کے چہرے پر شناسائی بھی تھی اور آنکھوں میں غصہ بھی۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟" خدیجہ نے اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"بات کرنا چاہتا ہوں میں تم سے...... یہاں سے کب فارغ ہو گی تم؟"

خدیجہ کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ساکت کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اس وقت اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ اس سے بات کرنا اس کے لئے کتنی بڑی قیامت ہو گا۔ اپنے آپ کو عزت دار سمجھنے والے واحد شخص کے سامنے آپ یہ کہیں کہ آپ...... وہ جواب دیئے بغیر دوسرے کسٹمر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مظہر وہیں کھڑا رہا۔ وہ کسٹمر چلا گیا تو مظہر پھر آگے بڑھ آیا۔

"تم یہاں سے کب فارغ ہو گی؟" اس نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

خدیجہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کاؤنٹر پر موجود چیزیں اٹھانی شروع کر دیں۔ مظہر کا چہرہ ایک لحظہ کے لئے سرخ ہوا۔ "میں تم سے بات کر رہا ہوں کیتھرین۔" اس بار اس نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

"میں آپ کو نہیں جانتی۔" اس نے سر اٹھا کر اپنے لہجے کے ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ وہ ساکت رہ گیا' وہ کاؤنٹر سے ہٹنے لگی جب اس نے کاؤنٹر پر دھرے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے اس طرح مت پیش آؤ کیتھرین کہ مجھے واقعی یہ یقین آنے لگے کہ میں نے تمہارے لئے اپنی زندگی کے چار سال ضائع کئے ہیں۔" مظہر کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔ یہ وہ واحد شخص تھا جس نے اسے ہمیشہ عزت دی تھی اور اس نے اس عزت کے بدلے اسے اپنے دل میں وہاں لا بٹھایا تھا جہاں وہ کسی دوسرے کو نہیں بٹھا سکتی تھی اور اس لمحے چھ سال بعد اس نے پہلی بار خود سے سوال کیا تھا۔

"چھ سال پہلے کیوں میں نے اپنا جسم بیچنا شروع کر دیا تھا کیا بہتر نہیں تھا کہ میں بھوک اور بیماری سے مر جاتی۔ کم از کم یہ لمحہ میری زندگی میں کبھی نہیں آتا کہ مجھے اس شخص کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا پڑتے؟"

اور چھ سال میں پہلی مرتبہ ہی اس نے خدا سے شکوہ کیا تھا۔

"میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا میرے اللہ کہ اب میں اس شخص کے سامنے سر اٹھانے تک کے قابل نہیں؟" اس کا دل چاہتا تھا' وہ کسی ننھے بچے کی طرح اس سے لپٹ کر رونے لگے۔ بلند آواز میں۔ اس بات کی پروا کئے بغیر کہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں' اس بات کی فکر کئے بغیر وہ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے۔

اس نے سر جھکا کر آہستہ سے مظہر کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکال لیا۔

"میں آٹھ بجے باہر آؤں گی۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"میں باہر پارکنگ میں تمہارا انتظار کروں گا۔" وہ کہتا ہوا چلا گیا۔

میری ذات ذرہ بے نشاں

سین 46

صبا کو یقین تھا۔ تائی کبھی قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر جھوٹ نہیں بولیں گی۔ عارفین اپنے ماں اور باپ کو لے آیا تھا۔ دوسرے دونوں تایا بھی آ گئے تھے۔ صبا کے کمرے میں کبھی اتنے لوگ نہیں آئے تھے۔ ہر چہرہ تناؤ سے دوچار تھا۔ وہ اٹھ کر وضو کرنے چلی گئی تھی۔ بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس نے وضو کیا تھا۔ پھر چہرہ اور آنکھیں خشک کر کے وہ کمرے میں آ گئی تھی۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی' یوں جیسے سب لوگ قوت گویائی سے محروم ہو چکے تھے۔ اسے عارفین پر ترس آنے لگا تھا۔

"جب اس کی ماں قرآن پاک پر ہاتھ نہیں رکھے گی تو عارفین کا کیا حال ہوگا۔ وہ کیا کرے گا۔"

اس نے عارفین کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا پھر اس نے تائی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا' وہ بس سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں۔ عارفین نے اقصیٰ کو قرآن پاک لانے کے لئے کہا تھا۔ صبا نے اپنی امی کو دیکھا وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ آنکھیں بند کئے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ اقصیٰ قرآن پاک لے آئی تھی۔ عارفین نے قرآن پاک ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ اپنی ماں کی طرف گیا تھا۔

"امی! آپ قرآن پاک ہاتھ میں لے کر کہیں کہ آپ نے صبا اور عادل کے خلاف کوئی منصوبہ نہیں بنایا اور نہ ہی کل رات ان دونوں کو میرے کمرے میں بھیجا تھا۔"

عارفین نے قرآن پاک ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ صبا کے دل کی حرکت تیز ہوگئی پھر اس کا سانس رک گیا تھا۔ تائی امی قرآن پاک ہاتھ میں لے رہی تھیں۔ اس نے بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھا پھر اس نے ان کو وہی کلمات دہراتے ہوئے سنا جو عارفین نے کہے تھے انہوں نے ایک بار نہیں تین بار جھکے ہوئے سر کے ساتھ وہی کلمات دہرائے تھے۔

"اللہ!" صبا کو لگا تھا کسی نے اس کے دل میں نیزہ گاڑ دیا تھا۔ اسے یقین تھا وہ کبھی قرآن پاک ہاتھ میں لے کر جھوٹ نہیں بولیں گی۔ اس کا یقین باطل ثابت ہوا تھا۔ اسے ان پر

یقین نہیں تھا اسے قرآن پر یقین تھا۔

"کیا کوئی قرآن پر ہاتھ رکھ کر جھوٹ بولنے کی ہمت کر سکتا ہے؟" اس نے سوچا تھا۔

"اور اب میں بھی قرآن پاک ہاتھ میں لے کر سچ بولوں گی اور اس کمرے میں موجود ہر شخص سوچے گا دونوں میں سے ایک جھوٹا ہے اور اس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر بھی جھوٹ ہی بولا ہے۔"

عارفین نے تائی امی سے قرآن لے لیا تھا۔ اب وہ اس کی طرف آ رہا تھا۔ ہر نظر اب اس پر جمی تھی۔ وہ رکے ہوئے سانس کے ساتھ اپنی طرف آتے دیکھتی رہی۔ عارفین کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

صبا نے تائی امی کا چہرہ دیکھا۔ کوئی ملال' کوئی رنج' کوئی پچھتاوا' اس چہرے پر کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی ماں کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں بے چینی تھی' آنسو تھے۔ امید تھی۔ اقصیٰ دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ عارفین اس کے پاس آ گیا۔

"صبا! اب تم قرآن پاک ہاتھ میں لے کر کہو کہ تم بے گناہ ہو۔ عادل کے ساتھ وہاں اپنی مرضی سے نہیں گئی تھیں۔"

اس نے قرآن پاک اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے عارفین کا چہرہ دیکھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ عارفین نے نظر چرا لی۔

"یہ لو قرآن پاک۔" اس نے کہا تھا۔ صبا نے سر جھکا دیا اس نے ہاتھ آگے نہیں بڑھائے عارفین کا سانس رک گیا۔

"صبا! قرآن پاک پکڑو۔" اس نے ایک بار پھر بے تابی سے کہا تھا۔ صبا نے سر اٹھایا تھا نہ ہاتھ بڑھائے تھے۔

"صبا!" امی کے حلق سے چیخ نکلی تھی۔ اقصیٰ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تائی امی دم بخود اسے دیکھ رہی تھیں۔ عارفین تھکے قدموں کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے قرآن پاک اس کی اسٹڈی ٹیبل پر رکھ دیا۔ صبا کی امی اور اقصیٰ روتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھیں۔ دونوں تایا بھی اٹھ کر کمرے سے چلے گئے تھے۔ صبا نے سر اٹھایا تھا۔

عارفین! مجھے تم سے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے نہ میں آئندہ تم سے کوئی مطالبہ کروں گی۔ بس مجھے اپنا نام دے دو' مجھے طلاق مت دینا۔ تم دوسری شادی کر لو' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"تمہیں نام کی کیا ضرورت ہے؟" وہ غرایا تھا۔

"عارفین! مجھ پر رحم کرو۔"

"تم نے مجھ پر رحم کیا تھا؟ بتاؤ تم نے مجھ پر ترس کھایا؟ پھر میں رحم کیسے کر سکتا ہوں۔

صبا کریم! میں عارفین عباس علی بقائمی ہوش و حواس تمہیں تین بار طلاق دیتا ہوں۔"

وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ تائی امی اور تایا بھی اس کے پیچھے چلے گئے تھے۔ وہ ساکت اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔

"صبا کریم! میں عارفین عباس علی بقائمی ہوش و حواس تمہیں تین بار طلاق دیتا ہوں"

آواز ایک بار پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اسٹڈی ٹیبل کے پاس آ گئی۔ بڑی احتیاط سے اس نے قرآن پاک اٹھایا تھا۔

"کسی نہ کسی کو تو قرآن کی حرمت کا پاس رکھنا تھا پھر اگر لوگ مجھے ترک کر دیتے ہیں تو اس پر میرا اختیار نہیں۔" وہ قرآن کو سینے سے لگائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

یہ جو ایک صبح کا ستارہ ہے

سین 47

اس دن بھی وہ اس کا ناشتہ لے کر آئی تھی۔ اس کے بیڈ کے پاس ٹیبل پر چیزیں رکھنے کے بعد وہ کسی کام سے ڈریسنگ روم میں چلی گئی تھی۔ ذیشان نے بے دلی سے ٹیبل پر نظریں دوڑائی تھیں۔ وہ چیزیں جو وہ روز کھاتا تھا۔ آج بھی اس کے سامنے تھیں۔ فرائیڈ انڈے بوائلڈ انڈے۔ بریڈ، سوپ، جیم، کوئی بھی نئی چیز نہیں تھی۔ بے دلی سے اس نے ناشتہ شروع کیا تھا۔

وہ سر جھکائے دل پر جبر کیے ہوئے ٹیبل پر جھکے چمچ سے سوپ پی رہا تھا جب اچانک ایک ننھا سا ہاتھ اس کے سامنے آ گیا تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ ٹیبل کو ایک ہاتھ سے تھامے دوسرا ہاتھ اس کے سامنے پھیلائے ماہم کھڑی تھی۔ وہ اپنی موٹی کالی گہری آنکھیں اس پر جمائے ہوئے تھی۔ پتا نہیں کس وقت وہ رینگتے رینگتے وہاں آ گئی تھی۔ اس نے کچھ ناگواری سے سر جھکا لیا مگر ہاتھ اب بھی اس کے سامنے تھا۔ مطالبہ واضح تھا۔ وہ کچھ کھانے کو مانگ رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر ڈریسنگ روم کی طرف دیکھا۔ رومیصہ ابھی بھی باہر نہیں آئی تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے ٹیبل پر نظر دوڑائی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیا دے۔ پھر اس نے ابلے ہوئے انڈے کا ایک ٹکڑا کچھ جھجکتے ہوئے اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اب وہاں سے چلی جائے گی مگر جانے کی بجائے وہ وہیں کھڑی ہو کر انڈا کھانے لگی، وہ آرام سے ناشتہ نہیں کر پا رہا تھا۔ کن اکھیوں سے وہ اسے انڈا کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہاں بلا کا سکون تھا۔

چند لمحوں کے بعد ہاتھ پھر اس کے سامنے تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اس بار بریڈ کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ رومیصہ اسی وقت ڈریسنگ روم سے باہر آئی تھی اور ماہم کو اس کے پاس کھڑے دیکھ کر وہ کچھ گھبرا گئی تھی۔ تیزی سے اس کے پاس آ کر اس نے ماہم کو اٹھا لیا تھا اور پیشتر اس کے کہ وہ بریڈ کے پیس کو منہ میں ڈالتی اس نے اس کے ہاتھ سے وہ پیس لے کر پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ پھر اسے لے کر وہ اسی تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں لیکن اس کی یہ حرکت اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے اس نے بریڈ کا پیس پلیٹ میں نہیں رکھا۔ ڈسٹ بن میں پھینک دیا ہے۔ اس کی تنہائی کا احساس اور بڑھ گیا تھا۔

ایمان اُمید اور محبت

سین 48

"تو مت کہیے اگر بات کہنے کے لیے لفظ نہ مل رہے ہوں تو اپنی اس بات یا جذبے پر ایک بار پھر سے غور ضرور کرنا چاہیے۔"

وہ ان کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔ "وہ میری زندگی کا حصّہ بن چکی ہے' اس کے بغیر میں اپنی زندگی کا تصور نہیں کر سکتا۔"

"انسان صرف خدا کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ باقی ہر چیز کے بغیر رہا جا سکتا ہے چاہے بہت تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی۔"

وہ قائل نہیں ہوا تھا مگر سر جھکا کر خاموش رہا۔

"جب تک انسان کو پانی نہیں ملتا' اسے یونہی لگتا ہے کہ وہ پیاس سے مر جائے گا مگر پانی کا گھونٹ بھرتے ہی وہ دوسری چیزوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے پھر اسے یہ خیال بھی نہیں آتا کہ وہ پیاس سے مر سکتا تھا۔" اس نے سر اٹھا کر ڈاکٹر خورشید کو دیکھا۔

"مگر لوگ پیاس سے مر بھی جاتے ہیں۔"

"نہیں' پیاس سے نہیں مرتے۔ مرتے تو وہ اپنے وقت پہ ہیں اور اسی طرح جس طرح خدا چاہتا ہے مگر دنیا میں اتنی چیزیں ہماری پیاس بن جاتی ہیں کہ پھر ہمیں زندہ رہتے ہوئے بھی بار بار موت کے تجربے سے گزرنا پڑتا ہے۔"

"تو کیا میں اس سے محبت نہ کروں؟"

"آپ محبت ضرور کریں مگر محبت کے حصول کی اتنی خواہش نہ کریں۔ آپ کے مقدر میں جو چیز ہوگی وہ آپ کو مل جائے گی' مگر کسی چیز کو خواہش بن کر' کائی بن کر اپنے وجود پر پھیلنے مت دیں ورنہ یہ سب سے پہلے ایمان کو نگلے گی۔ آپ نے اس عورت کے حصول کے لئے دعا کی' کوشش بھی کر رہے ہیں۔ اب صبر کر لیں اور معاملات اللہ پر چھوڑ دیں۔ پریشان ہونے' راتوں کو جاگنے اور سرابوں کے پیچھے بھاگنے سے کسی چیز کو مقدر نہیں بنایا جا سکتا۔"

اس رات وہ ان کی باتوں پر غور کرتا رہا تھا۔

لاحاصل

سین 49

وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے حدید کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ دھند بہت گہری ہو گئی تھی۔ کیتھڈرل کے اوپر لگا ہوا جگمگاتا ہوا ہولی کراس اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ دھند نے اسے نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ اس نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ چرچ میں اب بہت خاموشی تھی۔ پہلے والا شور بہت کم ہو چکا تھا۔ سروس بہت دیر کی ختم ہو چکی تھی اور اب دور پارکنگ سے گاڑیاں نکالنے کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ دونوں چپ چاپ بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں سوچ رہے تھے ایک ماضی کے بارے میں' دوسرا مستقبل کے بارے میں اور حال...... حال سے دونوں بے خبر نظر آ رہے تھے۔

"مجھے نہیں پتا محبت کیا ہوتی ہے اسے کس طرح ڈیفائن کرتے ہیں کس طرح وضاحت کرتے ہیں۔ میں یہ سب نہیں جانتا لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میں نے خدا سے بہت محبت کی ہے۔ اتنی محبت جتنی میں کر سکتا تھا۔"

کرسٹینا نے ایک طویل خاموشی کے بعد اپنے بائیں جانب اس کو بولتے سنا تھا۔ گردن موڑ کر اس نے حدید کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ کیتھڈرل کے اوپر لگے ہوئے کراس کو دھند میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"لیکن میرے پیرنٹس کی طرح خدا کے پاس بھی میرے لیے وقت نہیں ہے' میں نے جب بھی اس سے دعا کی ہے مجھے کچھ نہیں ملا پچھلے اٹھارہ انیس سال میں نے ایک جہنم میں گزارے ہیں۔ ہر دن میں خدا سے دعا کرتا تھا۔ اس سے درخواست کرتا تھا کہ وہ ہمارے گھر کو ٹھیک کر دے' سب لوگوں کے گھروں کی طرح میرے پیرنٹس ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہنا سیکھ لیں۔ میرے لیے ان کے پاس کچھ وقت بچ جائے' مگر کچھ بھی نہیں ہوا مجھے کچھ نہیں ملا جب ممی اور پاپا کی ڈائیوورس ہونے والی تھی تو میں نے خدا سے دعا کی تھی کہ ایسا نہ ہو وہ کبھی الگ نہ ہوں مگر ڈائیوورس ہو گئی۔ جب پاپا پر حملہ ہوا تب میں نے دل سے خدا کو پکارا تھا کہا تھا کہ پلیز میرے پاپا کو بچا لو میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ میں نے دعا کی تھی کہ ممی کو سزا سے بچا لو' انہیں کچھ نہ ہو۔ وہ میرے پاس

آخری رشتہ تھیں' مجھے ان سے محبت تھی مگر کچھ نہیں ہوا۔ میری کوئی دعا ان کے کام نہیں آئی۔ ممی کو سزا ہوگئی اور پھر ان کی ڈیتھ ہوگئی اور پھر میں نے ایک فقیر کی طرح خدا سے کہا تھا کہ وہ ٹینا کو مجھ سے جدا نہ کرے' اسے تو میرے ساتھ رہنے دے مگر...... مگر خدا نے میرے ساتھ کیا کیا۔ مجھ سے آخری چیز بھی چھین لی۔ جب میں امریکہ میں تھا تو وہاں میں نے ان لوگوں کو ہر بات پر Jesus کہتے سنا تھا۔ وہ اپنے پرافٹ کا نام لیتے تھے میرے سارے فرینڈز میں کوشش کرتا تھا اتنی ہی عقیدت سے اپنے پرافٹ کا نام لوں۔ ان سے مدد مانگوں انہیں بتاؤں کہ اللہ میرے ساتھ کیا کر رہا ہے اگر Jesus خدا سے اس کے فیصلے تبدیل کروا سکتے تھے تو پھر میرے پرافٹ کیوں نہیں۔ Jesus مسیح مردوں کو زندہ کر دیتے تھے مٹی کے پرندوں میں جان ڈال دیتے تھے۔ بیماروں کو ٹھیک کر دیتے تھے۔ وہ ایک دو نہیں لوگوں کے لئے بہت سے معجزے کیا کرتے تھے میں نے سوچا میرے پرافٹ میرے لیے یہ سب کیوں نہیں کرتے جبکہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ سب کچھ ان ہی کے بتائے طریقے سے مانگ رہا ہوں پھر بھی ان کے نزدیک میں کچھ بھی نہیں ہوں میری کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کوئی آخر کتنی بار ٹھکرایا جائے اور یقین کرو مجھے واقعی ہر بار لیٹ ڈاؤن کیا گیا ہے۔ ہر بار مجھے مایوس کیا گیا ہے۔ کوئی بھی شخص اپنے مذہب کو معمولی باتوں پر تو نہیں چھوڑتا کچھ نہ کچھ تو ایسا ضرور ہوتا ہے جو آپ کو کہیں اندر سے ہرٹ کرتا ہے اور میں ...... میں اندر سے ہرٹ ہوا ہوں ایک بار نہیں کئی بار۔ میرا ہاتھ اتنی بار جھٹکا گیا ہے کہ اب میں نے ہاتھ بڑھانا ہی چھوڑ دیا ہے۔ مذہب مشکل وقت میں آپ کا سہارا ہوتا ہے اگر یہ مشکل وقت میں بھی سہارا نہیں بن سکتا تو پھر ایسے مذہب کا کیا فائدہ۔ پھر میں تو خدا کے بنائے ہوئے دو مذاہب میں سے ایک کا انتخاب کر رہا ہوں۔ کوئی غلط کام تو نہیں کر رہا۔ میں ایک مذہب چھوڑ رہا ہوں اللہ کو تو نہیں چھوڑ رہا۔ تم بتاؤ کیا میں غلط کر رہا ہوں۔"

وہ اب اس سے سوال کر رہا تھا۔ وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

"اگر میں کہوں ہاں تو؟"

حدید نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔ شاید وہ اس جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے نہیں پتا' تم کیسی زندگی گزار رہی ہو۔ مجھے یہ بھی پتا نہیں کہ تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے یا نہیں۔ مگر میں نے اپنی ساری زندگی دوزخ میں گزاری ہے ایسے دوزخ میں جس میں مجھے میری کسی غلطی کی سزا کے طور پر نہیں ڈالا گیا تھا۔ جب آپ دوزخ میں ہونا تو پتا ہے زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہوتی ہے صرف ایک ہلکی سی معمولی سی ٹھنڈک کی تاکہ دوزخ کی گرمی کچھ تو کم ہو جائے۔ ٹینا میرے لیے وہی ٹھنڈک تھی۔ میں نے زندگی میں اس سے بڑھ کر کسی کو نہیں چاہا بلکہ شاید مجھے یہ کہنا چاہیے کہ میں نے زندگی میں اس

کے علاوہ کسی کو چاہا ہی نہیں۔ میں نے خدا سے کہا تھا۔ میں نے ہر چیز کھو دی ہے مجھے پروا نہیں ہے لیکن اگر ٹینا میری زندگی سے نکل گئی تو پھر سب کو بدل جائے گا۔ ہر چیز ختم ہو جائے گی۔ میرا یقین میرا پرافٹ میرا مذہب میں سب کچھ چھوڑ دوں گا اور میں نے خدا سے ریکوئسٹ کی تھی کہ وہ ایسا کبھی نہ کرے لیکن اس نے کیا۔ اس نے مجھے دکھا دیا کہ اسے میری پروا نہیں۔ اس نے مجھے بتا دیا کہ اس کے نزدیک میری ویلیو ایک چیونٹی جتنی بھی نہیں ہے۔ تم مجھے بتاؤ' میری جگہ اگر تم ہو تو تم کیا کرو گی۔ میں یہاں سے جس گھر میں واپس جاؤں گا وہاں نہ پیرنٹس ہیں نہ بہن بھائی وہاں صرف دیواریں ہیں اور دیواروں سے تو آپ کو محبت نہیں مل سکتی۔ دنیا میں کوئی ایک شخص نہیں ہے جس کو مجھ سے محبت ہو جس کے لیے میرا وجود کوئی معنی رکھتا ہو۔ جو میری پروا کرتا ہو' دنیا میں کتنے بلین لوگ ہیں ان میں سے ایک کو بھی حدید نام کے اس شخص کے وجود کی ضرورت نہیں ہے۔

تم کبھی اندازہ لگا سکتی ہو جب میں لوگوں کا ہجوم ہر جگہ دیکھتا ہوں تو میرا دل کیا چاہتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے ان میں سے کوئی میرا نام پکارے۔ کسی کے چہرے پر مجھے دیکھ کر مسکراہٹ آ جائے۔ مگر مجھے کوئی جانتا ہے نہ پہچانتا ہے۔ محبت تو بہت دور کی بات ہے۔ میں چرچ جانا شروع نہ کرتا تو میں پاگل ہو جاتا یا پھر خودکشی کر لیتا۔ میں زندگی سے اس حد تک تنگ آ چکا ہوں مجھے نہیں پتا اللہ نے دنیا کس کے لئے بنائی ہے مگر یہ کم از کم میرے جیسے انسان کے لیے تو نہیں بنائی۔"

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"جو بات میں تمہیں اب بتاؤں گی' شاید تمہیں اس پر کبھی یقین نہیں آئے گا۔ تم سوچو گے' میں جھوٹ بول رہی ہوں شاید تم قہقہہ لگا کر ہنس پڑو لیکن پھر بھی مجھے تم سے یہ بات تو کہنا ہی ہے۔"

حدید نے حیرانی کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی بھیگی پلکوں اور پرسکون چہرے کے ساتھ۔

"کیا تم کو یقین آئے گا کہ میں تمہاری محبت میں نہیں تمہارے عشق میں گرفتار ہوں۔"

اس کے جملے پر وہ ساکت رہ گیا تھا۔

"اور یہ عشق اس روز پارک میں تمہیں دیکھنے پر ہوا تھا۔ میں نے تمہیں' پہلی نظر تمہیں دیکھا تھا اور میں جان گئی تھی کہ میں اسیر ہو چکی ہوں۔ تم نہیں جانتے یہ بات تم سے کہنے کے لیے میں نے تمہیں اس دن کتنا ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر تم نہیں ملے اور اس دن میں نے اللہ سے کہا تھا کہ اگر تم مجھے دوبارہ مل گئے تو میں اسلام قبول کر لوں گی کیونکہ تم مسلم تھے اس دن تم نے سسٹر کو اپنا نام بتایا تھا نا؟"

وہ ایک لمحہ کے لیے خاموش ہوئی تھی۔ حدید کے چہرے پر بے انتہا بے یقینی تھی۔

"تم خاموش کیوں ہو' بولونا؟"

"کیا بولوں؟" وہ کچھ توقف کے بعد بولا تھا۔

"کچھ کہو۔" اس نے اصرار کیا تھا۔

"کیا کہوں؟"

"وہی۔"

حدید حیران ہوا تھا۔ "کیا؟"

کرسٹینا مسکرائی تھی۔ "کہ مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آ رہا۔"

حدید اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ "ہاں مجھے یقین نہیں آ رہا۔" چند لمحوں کے بعد اس نے کہا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے...... اور کبھی یقین کرنا بھی مت' پتا ہے کیوں؟ تم یقین کرو گے' اعتبار کرو گے تو میرا عشق اور گہرا ہوتا جائے گا۔ تمہیں پتا ہے یقین محبت کو اندھا کر دیتا ہے اور میں کسی سے اندھی محبت نہیں کرنا چاہتی کم از کم کسی انسان سے تو نہیں۔ تم میری بات پر یقین نہیں کرو گے تو مجھے ٹھوکر لگے گی ہر ٹھوکر مجھے سنبھلنے کا موقع دے گی۔ ایک بار نہیں دوبار نہیں مگر کبھی نہ کبھی تو میں سنبھل جاؤں گی۔"

حدید کو پہلی بار وہ لڑکی عجیب لگی تھی بے حد عجیب۔

"میں تمہیں...... میں تمہیں سمجھ نہیں پا رہا۔"

وہ اس کی بات پر مسکرائی تھی۔ "سمجھنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔"

"ایک ڈیل کرتے ہیں' تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہیں سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں اور جب ہم ایک دوسرے کو سمجھ لیں گے تو شاید میں کرسٹینا نہ رہوں مگر تم حدید ہی رہو گے۔ ایک ماہ تک ہم یہاں آئیں گے چرچ میں لیکن تم اپنی بات کرنا۔ میں اپنی بات کروں گی۔ تم میرے بارے میں جو پوچھو گے میں بتا دوں گی اور میں تمہارے بارے میں جو جاننا چاہوں' وہ تم بتا دینا۔"

وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا وہ اس کے سامنے جیسے شطرنج کی بساط بچھا رہی تھی یا پھر کوئی جگسا پزل رکھ رہی تھی۔

"ایک ماہ کے بعد ہم دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے۔ پھر نہ تم مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کرنا۔ نہ میں تمہیں ڈھونڈوں گی۔ تم وہ کہنا جو تمہارے دل میں آئے میں وہ کہوں گی جو میرے دل میں آئے گا۔ ہاں اور ایک ماہ تک تم بائبل پڑھو گے نہ ہی کسی مبلغ کے پاس جاؤ گے۔ صرف قرآن پڑھنا ترجمے کے ساتھ۔ اب میں جا رہی ہوں کل بارہ بجے میں یہاں آ جاؤں گی' کیا تم آؤ گے؟"

وہ اب کھڑی ہو کر اس سے پوچھ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ وہ اسے جھڑک دینا چاہتا تھا' وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اسے رستے سے نہ بھٹکائے' اسے وہاں جانے دے جہاں وہ جانا چاہتا تھا وہ اس سے کہنا چاہتا تھا۔ کہ وہ اس کی زندگی میں مداخلت کیوں کر رہی ہے اسے اس میں کیا دلچسپی ہے؟ وہ اس سے کیا چاہتی ہے؟ اور حدید نے کہہ دیا تھا۔

"ہاں میں آؤں گا۔"

وہ ایک بار پھر مسکرائی تھی۔

"خدا حافظ۔" وہ مڑ گئی تھی۔

"میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔ آپ کو کہاں جانا ہے؟" وہ بے اختیار اس کے پیچھے آیا تھا۔

"نہیں' میں یہ نہیں چاہتی۔"

"آپ مجھے اپنا کانٹیکٹ نمبر تو دے دیں۔" وہ اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

"تم مجھے اپنا فون نمبر دے دو۔" کرسٹینا نے رک کر اس سے کہا تھا' وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے جیب سے والٹ نکال کر ایک کاغذ اسے تھما دیا تھا۔ کرسٹینا نے دیکھے بغیر کاغذ مٹھی میں دبا لیا۔ وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا پارکنگ کی طرف آیا تھا۔ وہاں ابھی بھی بہت سے لوگ کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

کیتھڈرل کا اگلا حصہ بہت روشن تھا۔ وہ چرچ کے اندر جانے لگی تھی جب اسے اپنے عقب میں حدید کی آواز سنائی دی تھی اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ کچھ جھجکتا ہوا اس کے پاس آیا تھا۔

"مجھے ایک بات پوچھنی ہے۔ کیا... کیا...... کیا تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے؟"

حدید نے کرسٹینا کے چہرے کی مسکراہٹ کو گہرا ہوتے دیکھا تھا۔ "نہیں مجھے...... مجھے تم سے عشق ہے۔"

اس نے بڑی روانی سے کہا تھا۔ وہ مڑ کر اندر چلی گئی تھی۔ حدید وہیں کھڑا اسے لوگوں کے ہجوم میں گم ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کا دل چاہا تھا۔ وہ...... وہ اس سے دوبارہ ملے۔

ایمان اُمید اور محبت

سین 50

اس کے پاس ایمان کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ اس کے پاس شاید اب کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا۔

''میری چند ہفتے کی غیر موجودگی میں تم نے میرے خلاف اس طرح ثبوت اکٹھے کیے جیسے میں کوئی بہت خطرناک مجرم تھا جس سے جتنی جلدی چھٹکارا پا لیا جاتا' اتنا ہی بہتر ہوتا۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے چور کو بھی صفائی کا موقع دیا جاتا ہے۔ تم نے تو مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا۔ مجھے قتل کرنے کی پلاننگ کر لی۔''

اس نے سر جھکا لیا۔

''یہ سب کچھ کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ سکتی تھیں' میں ہمیشہ سے جانتا تھا کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے لیکن میں نے سوچا کہ محبت نہ ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ محبت ہو نہیں سکتی۔''

امید نے اپنے پیروں کی انگلیوں پر پانی کے چند قطرے گرتے دیکھے تھے۔

''میرا خیال تھا' کچھ وقت گزرے گا پھر تم مجھ سے محبت کرنے لگو گی۔ میری محبت' میری توجہ' میرا ایثار' میری قربانیاں تمہارا دل جیت لیں گی۔ تم میری پروا کرنے پر مجبور ہو جاؤ گی' کوئی فلم ہو' ناول ہو' ڈرامہ ہو یا پھر حقیقی زندگی ان سب میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ مجھے یہ غلط فہمی تھی کہ جہاں زیب تمہاری زندگی کا ایک ایسا باب تھا جسے تم بند کر چکی ہو۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ تم نے اسے ہمیشہ اپنے اور میرے درمیان رکھا۔ تم نے اس شخص کو کبھی اپنی زندگی سے جانے ہی نہیں دیا۔''

اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ ہاتھوں کی لرزش کو چھپانے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا۔ ایمان کے لہجے میں جھلکتا ملال اس کے پورے وجود کو لرزا رہا تھا۔

''تمہیں پتا ہے امید! اس شخص نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ اس نے تمہارے اندر بے یقینی کا ایک بیج بو دیا اور تم نے اس بیج کو سینچ کر درخت بنا دیا' اب بے یقینی اور بے اعتمادی کا یہ درخت اتنا تناور ہو چکا ہے کہ تم چاہو بھی تو اسے کاٹ نہیں سکتیں۔''

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ ایمان بھی کبھی اس سے یہ سب کہہ سکتا ہے۔

''کوئی شخص اپنی بند مٹھیوں میں دھول لے کر آتا ہے اور آپ کی آنکھوں میں دھول پھینک کر چلا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر شخص کی بند مٹھی میں دھول ہی ہو جس سے بچنے کے لیے آپ کو اپنی آنکھیں بند کرنا پڑیں۔ کم از کم میری مٹھیوں میں تمہارے لیے کوئی دھول نہیں ہے۔'' وہ اسے اپنے ہاتھ دکھا رہا تھا۔ ''میں نے کبھی محبت کے وجود پر یقین نہیں کیا۔ شاید...... شاید اسی لیے مجھے محبت ہو گئی اور میری محبت نے مجھے یقین اور ایمان دیا۔ تم نے ہمیشہ محبت کے وجود پر یقین کیا۔ محبت تمہیں بھی ہوئی مگر تمہاری محبت نے تمہیں یہ دونوں چیزیں نہیں دیں۔''

وہ بالکل بے حس و حرکت اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''ہم دونوں کی محبت کے معیار میں فرق تھا نہ انتہا میں...... جس شخص سے محبت کر رہے تھے۔ اس شخص میں فرق تھا۔ تم میں کھوٹ نہیں تھا جہاں زیب میں تھا۔ آگ کا کام پکانا ہوتا ہے اس پر سونا رکھو گے تو وہ اسے کندن بنا دے گی مگر پانی رکھو گے تو بھاپ بن کر اڑ جائے گا۔''

اسے لگ رہا تھا' سب کچھ ختم ہو رہا ہے۔

''ہم دونوں کے رشتے میں دراڑ آ گئی ہے مگر رشتہ ٹوٹا نہیں ہے۔ امید! ہمیں یہ ابھی طے کر لینا چاہیے کہ اس دراڑ کو پر کر دینا چاہیے یا رشتہ مکمل طور پر توڑ دینا چاہیے۔ کوئی مجھے جان بوجھ کر ڈینیل ایڈگر کہے گا تو میں برداشت نہیں کروں گا۔ ڈینیل ایڈگر سے ایمان علی بننے تک میں نے ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔ بہت کچھ چھوڑا ہے اور جس شخص کو میری اس شناخت پر یقین نہیں ہے مجھے اس کے ساتھ زندگی نہیں گزارنا۔''

اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''تمہیں چھوڑتے ہوئے مجھے بہت تکلیف ہو گی۔ اس سے کہیں زیادہ تکلیف جتنی مجھے اپنے ماں باپ کو چھوڑتے ہوئے ہوئی مگر میں اب کسی کسوٹی پر پرکھا جانا نہیں چاہتا۔ میں بار بار لوگوں کو وضاحتیں پیش کر سکتا ہوں نہ یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ میں واقعی مسلم ہوں۔ میں کسی کو یہ یقین دلانا بھی نہیں چاہتا۔ میں نے لوگوں کے لیے اسلام قبول نہیں کیا۔ یہ کام میں نے اللہ کے لیے کیا ہے اور میری نیت کو جانچنے کا اختیار صرف اسے ہے۔ کسی دوسرے کو نہیں' تمہیں بھی نہیں۔''

وہ اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے یا یہ شبہ ہے کہ میں ابھی بھی مسلم نہیں ہوں تو پھر تمہیں مجھ کو چھوڑ دینا چاہیے۔ مجھ سے الگ ہو جانا چاہیے۔'' اس کی آواز میں شکستگی تھی۔ ''میرے ساتھ رہ کر اگر تم خوش نہیں ہو تو تمہیں حق ہے کہ تم میرے ساتھ نہ رہو۔ مگر اپنے ذہن سے یہ نکال دو کہ میں

تمہیں چھوڑ کر بھاگ گیا یا آئندہ کہیں بھاگ جاؤں گا۔ میں تمہیں اور اپنے بچے کو مکمل طور پر اپناتا ہوں۔ تم میرے بچے کو اپنے پاس رکھ سکتی ہو میں تم دونوں کی ذمہ داری لیتا ہوں جب تک بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہو رکھ سکتی ہو۔ اگر دوسری شادی کرنا چاہو اور بچے کو پاس نہ رکھنا چاہو تو میں اسے اپنے پاس لے جاؤں گا۔ ابھی میں پاکستان میں ہی ہوں' جتنا عرصہ یہاں رہوں گا تم دونوں سے رابطے میں رہوں گا۔ اگر واپس کہیں اور جانا پڑا تب بھی تم لوگوں کے اخراجات پورے کرتا رہوں گا۔ اس کے بدلے میں یہ ضرور چاہوں گا کہ تم مجھے اپنے بچے سے ملتے رہنے دو۔"

اسے شاید پہلی بار اپنی کنپٹی سے بہنے والے خون کا احساس ہوا تھا اپنے زخم کو اس نے ہاتھ سے چھوا اور پھر انگلیوں پر لگے ہوئے خون کو دیکھا۔ سر اٹھا کر اس نے امید کو دیکھا۔ شاید وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر پھر وہ کچھ کہنے کے بجائے اسٹڈی ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔ دراز کھول کر اس نے کچھ نکالا تھا اور پھر امید کی طرف اچھال دیا۔ امید نے اپنے پیروں میں گرنے والی اس چیز کو دیکھا اور ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ ریوالور کی گولیاں تھیں۔

"مجھے اگر ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال آ جاتا کہ یہ ریوالور یہاں تم نے مجھے مارنے کے لیے رکھا ہے تو میں کبھی اس میں سے گولیاں نہ نکالتا۔ موت تمہارے منہ سے نکلنے والے لفظوں سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہو سکتی تھی۔"

وہ زمین میں دھنستی جا رہی تھی۔

"مجھے تم سے اس قدر محبت ہے امید! کہ تمہیں اتنی لمبی چوڑی پلاننگ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ چوکیدار کو بھیجنا' ریوالور کو چھپانا' ملازم کو غائب کرنا ......" وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔ "تم جب چاہتیں میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھے مار سکتی تھیں' میں کبھی تمہارا ہاتھ نہیں پکڑتا نہ تمہیں کوئی نقصان پہنچاتا۔ چاہو تو ابھی آزما کر دیکھ لو۔"

وہ کچھ دیر اس کے سامنے جیسے منتظر سا کھڑا رہا۔ یوں جیسے اسے یہی کرنے کی دعوت دے رہا ہو۔ وہ ہل نہیں سکی۔ وہ تھکے تھکے انداز میں اسٹڈی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ امید نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی مگر وہ اسٹڈی سے نکلنے کے بجائے وہیں رک گیا۔

"تم اگر پچھتا رہی ہو تو ...... مت پچھتاؤ ...... میں تمہیں اس سب کے لیے معاف کرتا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" اسٹڈی کا دروازہ بند ہو گیا۔